اُسوۂ رسُول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

سُورۃُ الاحزاب کے تیسرے رکوع کی روشنی میں

درسِ قرآن و خطابِ عام

ڈاکٹر اسرار احمد

ترتیب و تسوید

شیخ جمیل الرحمٰن

بار اوّل — ربیع الاوّل ۱۴۰۴ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۳ء — ۵۵۰۰
بار دوم — ربیع الاوّل ۱۴۰۸ھ مطابق نومبر ۱۹۸۷ء — ۲۲۰۰
ترتیب وتسوید ——— (شیخ) جمیل الرحمٰن
ناشر ——— اقتدار احمد
مطبع ——— نیو لائٹ پریس لاہور
قیمت : (اعلیٰ سفید کاغذ) ——— ۱۰ روپے
قیمت پیپر بیک ——— ۵ روپے
مقامِ اشاعت ——— ۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن۔لاہور
فون نمبر ۸۵۲۶۱۱
کراچی آفس ——— ۱۱ داؤد منزل (پہلی منزل) نزد آرام باغ۔شاہراہ لیاقت کراچی
فون نمبر ——— ۲۱۶۵۸۶

پیش لفظ

انگریزی کی دو سو سالہ غلامی کی وجہ سے جہاں بہت سی دوسری خرابیاں پیدا ہوئیں وہاں ہمارے دینی فکر میں سب سے بڑی کجی یہ پیدا ہوئی کہ مسلمانوں کے ذہنوں سے بحیثیت دین اسلام کا ہمہ گیر تصور محو ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دین اور مذہب کو ایک سمجھ لیا گیا۔ اور ان کے مابین فرق و تفاوت کو دانستہ یا نادانستہ یکسر فراموش کر دیا گیا۔ حالانکہ یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آسکتی ہے کہ دین اور مذہب میں زمین و آسمان یا کم از کم فرد اور کل کا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج "فرائضِ دینی" کا لفظ سنتے ہی مسلمانوں کی عظیم اکثریت کے اذہان میں جو تصور ابھرتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ "اسلام کے بنیادی ارکان" کی کی پابندی ہے۔

قرآن حکیم کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت دو اور دو چار کی طرح واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگ پسند ہیں جو ارکان دین پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جانب اپنی پوری زندگی میں اللہ کی بندگی و اطاعت پر کاربند ہوں اور دوسری جانب دین کی نصرت و حمایت یعنی دعوت و تبلیغ اور غلبہ و اقامت کے لئے بھی مقدور بھر سعی و جہد کریں۔ اور اس 'جہاد فی سبیل اللہ' کے لئے اپنی بیشتر و بہتر صلاحیتیں اور توتیں وقف کر دیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے 'فرائضِ دینی' کے اس جامع تصور کو سامنے رکھتے ہوئے اُمت مسلمہ کو اصلاح و فلاح کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بجائے "رجوع الی القرآن والسنۃ" کی اوّلاً 'مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب' کی بڑے پیمانے پر نشر و اشاعت اور

درس و تدریس کے ذریعے دین اور فرائضِ دینی کے جامع تصور کو قرآن مجید کی آیات بیّنات کے ذریعے پیش کیا اور پھر سیرت و سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے اسے مزید منقح و موکّد کیا۔ متذکرہ بالا "منتخب نصاب" کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کا جو مسلسل درسِ قرآن مجید لاہور کی مختلف مساجد میں جاری رہا ہے اس میں جب سورۂ احزاب زیر درس آئی اور اس میں وہ مشہور آیۂ مبارکہ آئی جو عموماً سیرت کی تقاریر کا عنوان بنتی ہے یعنی "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃٌ حسنۃ"، تو ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف یہ کہ اس موضوع درس کے دوران شرح و بسط سے کام لیا بلکہ ایک نہایت مدلّل و مفصّل تقریر اضافی طور پر فرمائی۔ جو راقم کے نزدیک اپنے موضوع پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ راقم نے فرائضِ دینی سے متعلق ڈاکٹر صاحب کی اُس تقریر اور سورہ الاحزاب کے دوسرے اور تیسرے رکوع کے درس کو نہایت محنت و جانفشانی سے ٹیپ سے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا اور پھر اسے معمولی حک و اضافے کے ساتھ بالاقساط "میثاق" میں شائع کیا ۔ اور اب ماہ ربیع الاوّل ۱۴۰۴ھ کی آمد کے موقع پر ان کی مستقل افادیت کے پیشِ نظر انہیں یکجا کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دین اور فرائضِ دینی کا صحیح فہم و شعور عطا فرمائے اور قرآنِ حکیم اور سُنّت و سیرتِ رسول ؐ کی رہنمائی کے مطابق ہمیں اپنے دینِ متین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے ۔

وبیداللہ التوفیق و علیہ التکلان

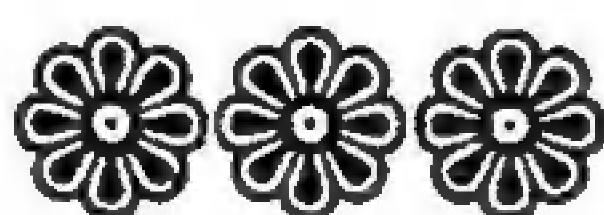
احقر

جمیل الرحمٰن

درس

آیات ۲۱ تا ۲۷

سورۂ احزاب



بمقام

جامع القرآن، قرآن اکیڈمی

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

مئی ۱۹۷۹ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ
اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾
وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ
اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿٢٢﴾ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ
مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿٢٣﴾ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ
وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا
رَّحِيْمًا ﴿٢٤﴾ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا وَكَفَى
اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿٢٥﴾ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ
ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ
فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿٢٦﴾ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ
وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿٢٧﴾

خطبۂ مسنونہ اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مندرجہ بالا رکوع کی تلاوت کی اور درس کا آغاز فرمایا۔

حضرات! آج کی ہماری گفتگو دو حصّوں میں ہوگی - ایک تو ان شاءاللہ ہم درس کی صورت میں اس رکوع کو ختم کریں گے - پھر اس رکوع میں اُسوۂ حسنہ سے متعلق جو مضامین آئیں گے، ان کو آج ہم صرف علمی اعتبار ہی سے سمجھنے پر اکتفاء نہیں کریں گے بلکہ اس رکوع کے مضامین کی جو تعلیم عملی صورت اور انطباق (PRACTICABLE APPLICATION) سے متعلق ہے۔ اور ہمارے لئے اُس میں جو عملی سبق ہے اُس کو آج میں رکوع کے بعد ایک تقریر کی شکل میں کسی قدر کھول کر آپکے سامنے رکھوں گا — لہٰذا ہم پہلے تو اپنے درس کے تسلسل ہی میں اس رکوع کو پڑھیں گے -

فرمایا: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ "یقیناً تمہارے لئے اللہ کے رسُول میں ایک نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔"

اُسوہ کے لفظ کا مادّہ ا- س و ہے - اُسوہ اور اِسوہ — دونوں اس کے تلفظ ہیں جس طریقے سے قِدوہ اور قُدوَہ دونوں ہم معنی ہیں ، یہ پیش کے ساتھ بھی ہے جیسے قُدوۃ العارفین - یعنی جو صالحین و عارفین کا رہنما ہو اسی طرح لفظ اُسوہ اور اِسوہ دونوں استعمال ہوتے ہیں اور اس کے معنی و مفہوم ہیں کسی کا اتباع کرنا، اور اس اتباع کو اپنے اوپر لازم کر لینا — خواہ اس میں کوئی تکلیف ہو خواہ مسرت — سائِئًا اَوْ ضَائِرًا کسی کے اتباع کو اپنے اوپر مسرت وراحت اور تکلیف و مضرت دونوں کیفیات میں لازم کر لینا اُسوہ ہوگا — اب ظاہر بات ہے کہ جب لفظی ترجمہ ایک لفظ کا ایک لفظ میں کیا جائیگا تو "نمونہ" اِس مفہوم کے قریب ترین مفہوم کا حامل ہے لیکن اس ترجمے سے اُسوہ کا حقیقی مفہوم (REAL SENSE) ادا نہیں ہوتا — اصل میں "اتباعِ سُنّت" کی جو اصطلاح ہمارے ہاں زیادہ معروف ہے یوں سمجھئے کہ اُسی کی ایک نہایت حسین و جمیل تعبیر لفظ اُسوہ میں موجود ہے -

یہاں 'لَكُمْ' (تمہارے لئے) عام ہے - گویا اس کے مخاطب صرف صحابہ کرامؓ نہیں ہیں، بلکہ تا قیامِ قیامت تمام مسلمانوں کے لئے نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ اور حیات طیبہ ایک اسوۂ حسنہ اور کامل نمونہ ہے۔
آگے بات چلی لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيْرًاO یہاں درحقیقت "لکم" کا بدل آرہا ہے۔ آیت کے اس ٹکڑے میں وہ دونوں مفاہیم جمع کر دیئے گئے جو قرآن مجید کے بارے میں سورۂ بقرہ میں دو مختلف مقامات پر آئے ہیں۔ قرآن اپنی جگہ ہر نوع بشر کے لئے ہدایت کاملہ اور ہدایت تامہ ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ تا قیام قیامت تمام نوع انسانی کے لئے ہر دور میں اس قرآن سے لوگوں کے لئے ہدایت و رہنمائی موجود ہے اور وہ ہر لحاظ و اعتبار سے اکمل و اتم ہے۔ چنانچہ قرآن کو "ھُدًی لِّلنَّاسِ" کہا گیا (البقرہ آیت ۱۸۵)، یہ علی الاطلاق ہے 'یہ ہدایت ہے تمام انسانوں کے لئے' ۔۔۔ لیکن سورۂ بقرہ کی دوسری آیت میں اس قرآن کو "ھُدًی لِّلْمُتَّقِيْنَ" قرار دیا گیا ہے ۔۔۔ گویا اس ہدایت سے استفادہ کرنے کی ایک شرط ہے اور وہ تقویٰ ہے۔ یعنی کچھ خدا ترسی ہو، کچھ اللہ کی طرف انابت ہو۔۔۔ نیکی اور بدی کا کوئی شعور بیدار ہو ۔۔۔ خیر اور شر میں انسان امتیاز کرتا ہو ۔۔۔ گویا تقویٰ کا جو اساسی سرمایہ ہے اور اس کا جو بنیادی اثاثہ ہے وہ موجود نہیں ہوگا تو انسان اس قرآن سے ہدایت حاصل نہیں کر سکے گا۔ قرآن اپنی جگہ ہدایتِ کاملہ و تامہ ہے لیکن اس سے استفادے کے لئے کوئی شرط خود انسان کے باطن میں پوری ہونی چاہیئے اور وہ شرط تقویٰ ہے لہٰذا آیت ۲ سورۂ بقرہ میں: الٓمّٓO ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَO اور آیت نمبر ۱۸۵ میں فرمایا: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ
آپ میں سے شاید بعض حضرات کے علم میں ہو کہ سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی بدنام زمانہ کتاب 'ستیارتھ پرکاش' کے چودھویں باب میں قرآن مجید پر جو اعتراضات کئے تھے انمیں پہلا اعتراض یہی تھا کہ 'یہ عجیب کتاب ہے جو کہتی ہے کہ متقیوں کے لئے ہدایت ہے۔ متقیوں کو ہدایت کی کیا ضرورت ہے! ہدایت کی ضرورت تو گمراہوں کو ہے، فاسقوں کو ہے'

فاجروں کو ہے — یہ کتاب متقیوں کو ہدایت دینے کے لئے نازل ہوئی ہے — قرآن مجید کا سرسری مطالعہ کرنے والوں کو یہ اشکال پیش آسکتا ہے - اس لئے کہ ہمارے ذہنوں میں تقویٰ کا جو تصور ہے، وہ یہ ہے کہ انسان بہت نیک ہو، بہت خدا ترس ہو، اور وہ ہر اعتبار سے اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے ہوئے ہو - یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی باتوں تک میں محتاط ہو — ایسے شخص کو ہم متقی کہیں گے — لہٰذا ان معانی میں جب لفظ تقویٰ سامنے آتا ہے تو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے بارے میں واقعتاً ذہن میں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے — وہ اشکال انتہائی بھونڈے طریقے پر اس شخص نے پیش کیا — تو اس کا حل یہی ہے کہ قرآن مجید درحقیقت "ھُدًی لِّلنَّاس" ہی ہے لیکن اس سے استفادے کے لئے شرط لازم یہ ہے کہ تقویٰ کا کچھ نہ کچھ بنیادی اثاثہ موجود ہو — ایک شخص میں اگر نیکی اور بدی اور خیر و شر کی تمیز کی کچھ بھی پونجی باقی ہے، تو گویا وہ بنیاد موجود ہے جس پر ہدایت کا دار و مدار ہے آج کل کی تعمیرات کی ٹیکنیک میں جس کو STARTER کہتے ہیں، ———

یعنی اگر آپ کو عمارت کا کالم اور مزید اوپر لے جانا ہے تو کچھ سریے باہر نکلتے چھوڑ دیتے جاتے ہیں تاکہ اوپر کے کالم کو چڑھاتے وقت اس کا جوڑ اس کے ساتھ لگ جائے - پس جس طرح کسی عمارت کے کالم کو مزید اوپر لے جانے کے لئے STARTER کا ہونا ضروری ہے بعینہٖ یہ بات ہے کہ اصلاً تو قرآن مجید ھُدًی لِّلنَّاس ہے لیکن اس سے استفادے کے لئے تقویٰ یعنی خیر و شر اور نیکی و بدی کی کچھ نہ کچھ تمیز انسان میں ہونی ضروری ہے — مزید برآں بعینہٖ یہی بات یہاں بھی ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پوری نوع انسانی کے لئے بھی مجسم ہدایت ہیں - آپؐ کے لئے قرآن مجید میں لفظ نور آیا ہے - بایں معنی کہ آپؐ نورِ ہدایت اور شمع ہدایت اور سراجاً منیراً ہیں اسی طرح قرآن مجید آپؐ کو رحمۃ للعالمین قرار دیتا ہے - یعنی آپؐ کا وجودِ قدسی تمام جہانوں اور تمام ادوار کے لئے رحمت ہے - بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ قرآن مجید کتاب متلو ہے - یہ مصحف ہے اور نبی اکرمؐ قرآنِ

مجسم ہیں صلی اللہ علیہ وسلم — جیسا کہ آپؐ کی وفات کے بعد چند لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے آپؐ کی سیرت کے متعلق دریافت کیا تھا تو آپؓ نے جواب میں فرمایا تھا: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ — لیکن آپؐ کے اس اُسوۂ نور اور شمع ہدایت سے روشنی حاصل کرنے کے لئے بھی چند شرائط کو پورا کرنا لازم ہے اگرچہ آپؐ اپنی جگہ شمع ہدایت ہیں اور جو چاہے آپؐ کے اُسوۂ حسنہ سے رہنمائی حاصل کرلے لیکن اس کے لئے چند شرائط ہیں -!

ان شرائط کو بایں الفاظ بیان کیا گیا:

لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيرًا ۝

"ہر اس شخص کے لئے (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اعلیٰ وارفع نمونہ ہے) جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے"۔

اب آپ غور کریں گے تو آیت کے اس حصے میں دو چیزیں جمع ہوگئی ہیں - ایک 'ایمان باللہ' اور دوسرا 'ایمان بالآخرہ' — ہمارے دین کے تین PILLARS OF FAITH ہیں - ایمان باللہ یا توحید — ایمان بالآخرہ یا معاد اور ایمان بالرسالت — ایمان بالرسالت سے نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا تعلق ہے - یہ ایمانیات ثلاثہ باہم گتھے ہوتے ہیں — اگر انسان کا اللہ پر ہی یقین نہیں یا اس میں شرک شامل ہے — تو وہ نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو اپنے لئے نمونہ کیسے بنالے گا! اور اگر آخرت کا اُسے یقین نہیں، تو پھر وہ آں حضرتؐ کے نقشِ قدم کی پیروی کیسے کریگا! یہ پہلی دو چیزیں ہوں گی تو تیسری بات کا ایک امکان پیدا ہوگا- یعنی اللہ سے غافل شخص یا اس شخص کے لئے جو کبھی کبھار یا اتفاقاً اللہ کا نام لینے والا ہو، اور جو اللہ سے ملاقات کی حقیقی امید دل میں نہ رکھتا ہو - اسی طرح جس شخص کو یوم آخرت اور محاسبۂ اُخروی کی کوئی توقع نہ ہو، گویا جو ان دو ایمانیات سے تہی دست ہو، اس کے لئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ

اُسوہ اور نمونہ نہیں بن سکتی —— آں حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کا اتباع وہی شخص کر سکے گا جو اللہ کے فضل اور اس کی عنایات کا امیدوار ہو اور جس کو یہ بھی دھڑکا لگا ہوا ہو کہ آخرت ہونے والی ہے ۔ جہاں کی کامیابی کا سارا دار و مدار اسی بات پر ہوگا کہ اس دنیا کی زندگی میں اس کا طرزِ عمل اور رویّہ اللہ کے رسول سے کس درجے قریب تر رہا ہے ۔ لہٰذا بات صاف کر دی گئی کہ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا ○ —— اس پوری آیت کا مطلب یہ ہوا کہ آپؐ کی زندگی اس شخص کے لئے اسوۂ حسنہ ہے اور وہی اس کا اتباع کر سکے گا اور وہی آپؐ کے نقشِ قدم پر چل سکے گا جو اللہ کا طالب ہو اور جو آخرت میں سرخروئی چاہتا ہو اور جو کثرت کے ساتھ اللہ کو یاد کرنے والا ہو —— یہاں رَجَاء کا جو لفظ آیا ہے وہ نہایت لطیف ہے ۔ اس میں طالب ہونے کا مفہوم بھی شامل ہے ۔ اور اللہ سے ملاقات کا امیدوار ہونے کا مفہوم تو بالکل واضح ہے اور اس کی وضاحت وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ سے مزید ہو گئی ۔ یہاں امیدواری میں اللہ کی رحمت، اللہ کی شفقت، اللہ کی نظرِ عنایت کے جملہ مفاہیم شامل ہیں ۔ جیسے سورۂ کہف کی آیت نمبر ۲۸ کے درمیان میں فرمایا اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ ۔ " وہ لوگ جو پکارتے ہیں اپنے ربّ کو صبح و شام اپنے ربّ کے چہرۂ انور کے طلب گار بن کر" —— وہ اللہ سے محبت کرنے والے ہیں —— وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط —— اس کی رضا و خوشنودی کے طالبین ہیں —— یہاں فرمایا:

لِمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ ۔ " جو اللہ کی رضا کا اُمیدوار ہے اور جو یوم آخرت میں سرخروئی کی توقع رکھتا ہے" ——

گویا اُسے یقین ہے کہ یہ دن آکر رہے گا اور جزا و سزا کے فیصلے ہو کر رہیں گے ۔

وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا ○ "اور وہ اللہ کو یاد رکھتا ہو کثرت کے ساتھ"

یعنی وہ ہر کام اور معاملے میں اللہ کے احکام اور اس کے اوامر و نواہی کا التزام

واہتمام کرتا ہو اور زبان و قلب سے بھی اللہ کو یاد کرتا ہو ۔ وہ اس بات کو ہر لمحہ اور ہر لحظہ قلب و شعور میں مستحضر رکھتا ہو کہ اُسے یوم آخرت میں اللہ کی عدالت میں پیش ہو کر اپنی اس دنیوی زندگی کا حساب دینا ہے ۔ یہ تین شرطیں پوری ہوں گی تو اُسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر کسی درجے میں عمل پیرا ہونے کا امکان پیدا ہو گا ۔

اب چونکہ یہاں نبی اکرمؐ کے اتباع کا مضمون چلا ہے تو ضرورت تھی کہ مثال پیش کر کے بتایا جائے کہ آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کا اتباع کرنے والوں کا رویّہ کیا ہوتا ہے ! ۔ ان کے طرزِ عمل میں کیا فرق واقع ہوتا ہے ! لیکن قرآن حکیم میں یہ اسلوب آپ کو عام ملے گا کہ استدلال کی کڑیوں کو بسا اوقات اس طرح نمایاں نہیں کیا جاتا ، جس طرح ہم نمایاں کرتے ہیں کہ اس بات کا نتیجہ یہ نکلا یا یہ نکلنا چاہیئے ۔ جیسے ہم کہیں گے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اُسوۂ حسنہ کی کامل مثال دیکھنی ہو تو صحابہ کرام رضؓ کی زندگیوں کو دیکھو جو اس اُسوۂ حسنہ کی پیروی کی مکمل تصویر کا نقشہ پیش کرتی ہیں ۔ یہاں یہ بات کہے بغیر اس اُسوے کی پیروی کا ان الفاظ میں ذکر فرما دیا گیا :

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۔

"اور (حقیقی) مومنوں کا حال اس وقت جبکہ انہوں نے دشمنوں کے لشکروں کو دیکھا تو یہ تھا کہ وہ پکار اٹھے کہ یہ وہی بات ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا ۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی "

یہ بات گویا کہ اس اُسوۂ حسنہ کی پیروی کا ایک عملی نمونہ اور مظاہرہ ہے ۔ یہ اُسوۂ حسنہ کیا ہے جس کا اس سورۃ الاحزاب میں ذکر کیا گیا ہے اُسے ہمیں ذرا تفصیل سے سمجھنا ہو گا ۔ یوں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی ہر مسلمان کیلئے ہر اعتبار سے ایک کامل نمونہ ہے ۔ ایک باپ کے لئے آپؐ بہترین نمونہ ہیں کہ ایک باپ کو اپنی اولاد کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے ۔ ایک

شوہر کے لئے آپؐ کامل نمونہ ہیں کہ اُسے اپنے گھر میں اپنی بیوی یا بیویوں کے ساتھ کیا رویّہ اختیار کرنا چاہیئے ۔ایک پڑوسی کے لئے آپؐ اُسوۂ کاملہ ہیں۔ ایک مرشد و مزکی اور ہادی و داعی اور مبلغ کے لئے آپؐ اُسوۂ کاملہ ہیں ۔ایک حکمران (HEAD OF THE STATE) کے لئے آپؐ اُسوۂ کاملہ ہیں ۔ایک سپہ سالار کے لئے آپؐ اُسوہ کاملہ ہیں ایک فاتح کے لئے آپؐ اُسوۂ کاملہ ہیں ۔ایک منصف (JUDGE) اور قاضی القضاۃ (CHIEF JUSTICE) کیلئے آپؐ اسوۂ کاملہ ہیں — زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ اکمل و اتم نہ ہو ۔ میں کئی مرتبہ سیرت کی تقاریر میں اپنے اس شدتِ تاثر کو بیان کر چکا ہوں کہ سیرت مطہرہ کے مطالعے سے میں مبہوت ہو جاتا ہوں اور میرے قلب پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ اور قدسی شخصیت کا جو گہرا تاثر ثبت ہوتا ہے وہ اس بات کا ہوتا ہے کہ اس قدر جامع شخصیت اور اتنی گمبیر زندگی تو ہمارے تصور میں بھی آنی ممکن نہیں — کیا زندگی کا کوئی گوشہ ایسا ہے جو اُسوۂ حسنہ کے اعتبار سے نامکمل و ناتمام اور خالی نظر آتا ہو! — ہر پہلو سے معروف ترین زندگی — ہمارا حال تو یہ ہو گیا ہے کہ جو مسجد کا امام ہو، وہ عموماً خطابت نہیں کرتا ۔خطیب علیحدہ ہونا چاہیئے —جو خطیب صاحب ہیں وہ پانچ وقت کی نماز پڑھانے کی پابندی کیسے قبول کرلیں گے !- گویا کہ امامت علیحدہ ۔خطابت علیحدہ پھر مدرس علیحدہ — مزید براں جو صاحب مدرس کے فرائض انجام دے رہے ہوں، عام طور پر ان سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ یہ تزکیہ و تربیت بھی کریں گے ۔ اس کے لئے کہیں اور جائیے ۔ یہاں سے تو علم حاصل کر لیجئے ۔ مدرسین قال اللہ تعالیٰ اور قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا دیں گے ۔ تزکیۂ نفس کے لئے عموماً کسی دوسرے مزکی و مرشد کی تلاش کرنی ہوگی، جن کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر یہ مرحلہ طے کرنا ہوگا —— پھر جو لوگ ان شعبوں سے متعلق ہیں وہ آپ کو کہیں سپہ سالار بھی نظر آتے ہیں! اور کچھ انتظامی امور کی انجام دہی میں مصروف ملیں گے !! ایسے لوگ اگر لکھنے پڑھنے اور مدرسی معلمی

میں زندگی بھر لگے رہے یا دعوت و تبلیغ ہی میں پوری زندگی کھپا دی اور ان میدانوں میں انہوں نے کوئی قابل قدر کارنامہ انجام دیا تو عموماً ایسے لوگوں کے گھر گرہستی والا کھاتہ کورا نظر آئے گا۔ معلوم ہوگا کہ ساری عمر شادی ہی نہیں کی جب کہیں جاکر یہ کام انجام دیئے ہیں ـــ یہ جو جامعیت ہے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ـــ وہ پوری انسانی تاریخ حتیٰ کہ انبیاء و رسل کی مقدس جماعت میں بھی کہیں نظر نہیں آئے گی ـــ آپؐ مسجد نبوی کے امام بھی ہیں اور پنج وقتہ امام ہیں ـ آپؐ مسجد نبوی کے خطیب بھی ہیں ـ اصحابؓ صفہ کے لئے مدرس و معلم بھی ہیں ـ تمام صحابہ کرامؓ کے لئے آپ مزکی و مربّی بھی ہیں ـ آپؐ ہی سپہ سالار بھی ہیں ـ صلح کی گفتگو ہو رہی ہے تو آپؐ ہی کر رہے ہیں ـ باہر سے جو وفود آ رہے ہیں تو ان سے آپؐ ہی معاملہ کر رہے ہیں ـ مقدمات و تنازعات ہیں تو وہ آپؐ کی عدالت میں پیش ہو رہے ہیں ـــ تصوّر تو کیجئے کہ کونسی چیز اور کونسا پہلو ہے جہاں یہ محسوس ہو کہ یہیں حضورؐ کی زندگی میں نمونہ نہ مل سکتا ہو ـــ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کا جائزہ لیجئے ـــ بغیر کسی تنقیص کے میں یہ عرض کر رہا ہوں ـــ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے بچائے کہ میں کسی نبی کی توہین کروں، لیکن واقعہ تو واقعہ ہے کہ ایک باپ کے لئے ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں ـ ایک شوہر کے لئے ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں ـ کسی قاضی! کسی سپہ سالار، کسی فاتح اور کسی صدرِ ریاست کے لئے تو ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں ـــ آں جنابؑ ایک درویش اور ایک مبلّغ اور ایک مربّی و مزکی کی حیثیت سے ایک مکمل نمونہ ہیں، لیکن زندگی کے دوسرے شعبے اور پہلو خالی نظر آ رہے ہیں ـ لہٰذا اس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ میرے قلب و ذہن اور شعور و ادراک پر جس چیز کا سب سے گہرا تاثر ہے وہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کی اسی جامعیت کا ہے ـــ میں جب گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہوں اور حالات کو خود اپنے اوپر وارد کرتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہم ایک ذمہ داری کا بھی حق ادا نہیں کر پاتے اور اسے نباہ نہیں پاتے اور وہاں کیا عالم ہے! کونسی ذمہ داری ہے جو نہیں اٹھائی

ہوئی ہے اور اس کو کما حقہ پورا نہیں کیا ہے! کون سی ذمہ داری ہے جس کی ادائیگی میں کوئی کمی رہ گئی ہو ـــ الغرض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ حسنہ ہر اعتبار، ہر پہلو اور ہر حیثیت سے اکمل و اتم ہے ـــ حضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ تو اللہ کا نازل کردہ قرآن حکیم ہے اور دوسرا معجزہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم خود اپنی ذات اور شخصیت میں ایک عظیم معجزہ ہیں اور اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس قدر گھمبیر اور اتنی ہمہ گیر زندگی آپؐ نے گزاری ہے کہ ہمارے ہوش اور حیطۂ خیال میں بھی نہیں آتی ـــ یہ بھی خاصۂ نبوّت ہے اور اللہ تعالےٰ کی طرف سے ودیعت شدہ صلاحیتیں اور قوتیں ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے کے اعتبار سے ایک اسوۂ کامل ہیں۔ لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ قرآن مجید میں جب یہ لفظ اُسوۂ حسنہ آیا ہے تو کس سیاق و سباق اور سلسلۂ عبارت (CONTEXT) میں آیا ہے ـــ میں نے عرض کیا تھا کہ ہمیں اس بات کو ذرے تفصیل سے سمجھنا ہوگا کہ آپؐ کا اصل اور خصوصی اُسوہ کونسا ہے! ـــ یہ اُسوۂ حسنہ وہ ہے جو ہمیں غزوۂ احزاب میں نظر آتا ہے ـــ وہ صبر و ثبات، اللہ کے دین کے لئے سرفروشی اور جاں فشانی اور حال یہ تھا کہ جان نثاروں کے شانہ اور قدم بقدم ہی نہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر ہر مشقت میں آپؐ بھی شریک تھے۔ کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو دوسروں نے اٹھائی ہو اور آپؐ نے نہ اٹھائی ہو۔ یہ نہیں تھا کہ کہیں زرنگار خیمہ علیحدہ لگا دیا گیا ہو اور قالین بچھا دیئے گئے ہوں اور وہاں حضورؐ آرام فرما رہے ہوں اور مورچھل جھلے جا رہے ہوں اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہی خندق کھودنے کے لئے کدالیں چلا رہے ہوں۔ بلکہ معاملہ یہ تھا کہ خندق کھودنے والوں میں آپؐ بھی شامل ہیں۔ کدالیں چلاتے ہوئے صحابہ کرامؓ بیک آواز کہہ رہے ہیں ؎ اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَةِ

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ آواز میں آواز ملا کر فرما رہے ہیں کہ فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَةَ۔

یعنی سردی اور بھوک کی تکالیف اٹھانے میں آپؐ برابر کے شریک ہیں ـــ

بھوک اور نقاہت سے کہیں کمر دہری نہ ہو جائے اس خیال سے صحابہ کرامؓ نے اپنے پیٹوں پر پتھر باندھ رکھے ہیں۔ ایک صحابیؓ حضورؐ کو اپنے پیٹ پر بندھا ہوا پتھر دکھاتے ہیں تو سرورِ عالم محبوب رب العالمین، خاتم النبیین والمرسلین اپنا کرتا اٹھاتے ہیں تو ان صحابیؓ کو شکم مبارک پر دو پتھر بندھے نظر آتے ہیں۔ محاصرے کے دوران آپؐ ہر وقت خندق میں موجود رہے اور جس طرح صحابہ کرامؓ تکان سے چور ہو کر پتھر کا تکیہ بنا کر تھوڑی دیر کے لئے آرام کی خاطر لیٹ جاتے تھے، اُسی طرح حضورؐ بھی وہیں کھلی زمین پر کچھ دیر کے لئے پتھر پر سر رکھ کر آرام فرما لیا کرتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ آپؐ نے استراحت کے لئے اپنے واسطے کوئی خصوصی اہتمام فرمایا ہو ــــ بنی قریظہ کی غدّاری کے بعد جس خطرے میں سب مسلمانوں کے اہل وعیال مبتلا تھے، اُسی سے آپؐ کے اہل بیت بھی دوچار تھے۔ اپنے لئے یا اپنے اہل وعیال کے لئے آپؐ نے حفاظت کا کوئی خصوصی انتظام نہیں کیا تھا۔

یہ ہے اصل صورتِ واقعہ اور صورتِ حال۔ جس میں فرمایا گیا ہے کہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ــــ ہم چھوٹی چھوٹی سنّتوں کی پیروی کر کے یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ہم اسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام پر عمل پیرا ہیں ــــ ویسے تو ہر چھوٹی سی چھوٹی سُنّت بھی وقیع اور لائق اتباع ہے۔ لیکن اگر یہ چھوٹی سنتیں اُس اصل اور بڑے اُسوہ کے لئے اوٹ بن جائیں تو یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہے۔ اگر ان چھوٹی سُنّتوں پر عمل کرنے کے باعث کسی کو یہ مغالطہ اور فریب ہو گیا ہے کہ "میں بڑا متبع سنت ہوں" ــــ میں نے داڑھی بھی چھوڑ رکھی ہے۔ لباس میں بھی میں سنت کو پیشِ نظر رکھتا ہوں ــــ میں نے یہ بھی اہتمام کر رکھا ہے اور وہ بھی اہتمام کر رکھا ہے ــــ دیکھنا یہ ہے کہ یہ 'اسوہ' بھی زندگی میں ہے یا نہیں! جو سُورۂ احزاب میں بیان ہوا ہے۔ یہ دعوت وتبلیغ اور اقامت واظہار دین الحق کے لئے سرفروشی جاں فشانی اور عملی جدوجہد اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات، تکالیف اور مصائب کو برداشت کرنا ــــ اگر زندگی میں یہ نہیں ہے تو پھر کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر

تو یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں آڑ بن گئی ہیں ۔ اس تل کے پیچھے پہاڑ اوٹ میں آچکا ہے اور ہمارا اس وقت سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا اصل 'اسوہ' ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے (الا ماشاء اللہ) اور وہ اسوہ یہ ہے جو سورۃ الاحزاب میں نہایت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے اور غزوۂ احزاب کے حالات کے بیان میں قرآن حکیم اس کی طرف خصوصی طور پر مسلمانوں کی نگاہوں کو مرتکز (FOCUS) کرتا ہے ۔

پھر اس اسوۂ حسنہ کا جو ٹھپّا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرت و کردار پر لگا ہے اور اس کی جو چھاپ ان کی زندگیوں میں آئی ہے وہ یہ ہے : وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ـــ ان کے اوپر یہ ہے چھاپ ۔ جیسے کوئی مشین یا پریس ہو، اس میں لوہے کے ٹکڑے یا کاغذ رکھے ہوں تو جو ڈائی یا بلاک ان میں فٹ ہے، اسی کا نقش (IMPRESSION) آتا چلا جائے گا تو اس 'اسوہ' کا نقش یہ ہے جو صحابہ کرام رضؓ نے قبول کیا ـــ ہم چھوٹی چھوٹی سنتوں کا مجموعہ بنا کر اسے ہی کلّ 'اسوہ' سمجھ بیٹھے ہیں اور ہمارا حال (الاّ ماشاء اللہ) یہ ہو گیا ہے کہ مچھر چھانتے جاتے ہیں اور سموچے اونٹ نگلے جا رہے ہیں ـــ یہ وہ تمثیل ہے ۔ جو علمائے یہود کے اس طرزِ عمل پر حضرت مسیح علیہ السلام نے دی تھی کہ مہماتِ دین اور مقتضیاتِ دین کی طرف سے تو انہوں نے آنکھیں بالکل پھیر لی یا بند کر رکھی تھیں اور جزئیات و فروعات کو وہ کل دین سمجھ بیٹھے تھے اور اسکی تدریس و تعلیم میں مصروف رہتے تھے ۔ اور ذرا سی کمی بیشی پر لوگوں کو سرزنش بھی کرتے تھے اور ان کی تکفیر بھی ـــ حضرت مسیحؑ کی بیان کردہ یہ تمثیل دُنیا کے ہر کلاسیکل ادب میں ہمیشہ ہمیش کے لئے ضرب المثل بن گئی ہے ـــ میں پھر عرض کر دوں کہ خدارا میری اس گفتگو کا ہرگز یہ مطلب نہ سمجھ لیجئے گا کہ میں چھوٹی چھوٹی سنتوں کی تحقیر کر رہا ہوں یا ان کی اہمیت گھٹا رہا ہوں ۔ معاذ اللہ ـــ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر سنّت چاہے

وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو واجب الاتباع ہے ۔ ان کا اہتمام والتزام اگر اس 'اسوہ' کے ساتھ ہو جو اس سورۂ مبارکہ کے مطالعے کے ذریعے ہمارے سامنے آ رہا ہے تو سونا ہے ۔ اس کے بغیر ہو تو تانبا ہے ۔ جس کی سونے کے مقابلے میں کوئی قدر و قیمت نہیں ـــــ اس لئے کہ اگر نسبت و تناسب درست نہیں ہو گا تو صحیح نتیجہ کیسے برآمد ہو گا ! ـــ پھر تو وہی طرزِ عمل وجود میں آئے گا جو میں حضرت مسیحؑ کی تمثیل کے حوالے سے عرض کر چکا ہوں ـــ اس 'اسوہ' کی جو چھاپ صحابہ کرامؓ کی شخصیتوں پر پڑی تو کیفیت یہ ہو گئی کہ جب انہوں نے دیکھا ان لشکروں کو جو اُمنڈ اُمنڈ کر اِدھر سے بھی آ رہے ہیں اور اُدھر سے بھی آ رہے ہیں ۔ خیبر سے کیل کانٹے سے لیس یہودیوں کے لشکر بھی آ گئے مکّہ سے ابوسفیان ایک لشکر جرار لے کر آ گئے ہیں ۔ مشرق سے غطفان کے قبائل آ گئے ہیں ـــ گذشتہ ہفتے دوسرے رکوع کے درس میں ہم سیرت کی مستند کتابوں کی روشنی میں یہ تمام حالات پڑھ چکے ہیں ۔ ان تمام حالات کا نقشہ کھینچ کر پچھلے رکوعؑ کی آیت نمبر ۱۱ میں فرمایا گیا تھا : هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ۝۱۱ "یہ وہ وقت تھا جب اہلِ ایمان خوب آزمائے گئے اور بڑی طرح ہلا مارے گئے ـــ" یہ نہایت کڑا امتحان تھا صحابہ کرامؓ کے صبر و ثبات کا ۔ یہ آزمائش تھی ان کی استقامت اور استقلال کی ـــ سردی کا موسم تھا ۔ پھر ہر چہار طرف سے حملہ آوروں کے لشکر پر لشکر جمع ہو گئے تھے جن کی مجموعی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی تھی اور مسلمان خندق میں محصور تھے ، جس کا نقشہ ان الفاظ میں بیان ہوا کہ : إِذْ جَاءُوكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ ـــ دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ برابر خبریں مِل رہی تھیں کہ مدینہ کے باہر جنوب مغرب میں ایک مضبوط گڑھی میں بنی قریظہ کا جو یہودی قبیلہ آباد تھا اور جس سے معاہدہ تھا کہ وہ مدینہ پر حملے کی صورت میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے ' ـــــ وہ ساتھ دینے کے بجائے نقضِ عہد پر تلے بیٹھے ہیں اور کچھ پتہ نہیں کہ وہ پیچھے سے کب مدینہ پر حملہ آور ہو جائیں جہاں نہ صرف

دفاع کا کوئی انتظام نہیں بلکہ مدینہ میں صرف خواتین اور بچے موجود تھے - ان حالات میں اہل ایمان کی کیفیات کیا ہیں اور ان کی زبان سے کیا الفاظ نکلے ایہ کہ :

قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ	"انہوں نے کہا کہ یہ حالات پیش
وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ	آنے والے تھے جن کا وعدہ کیا تھا
وَرَسُوْلُهٗ —	اللہ نے اور اس کے رسول نے رصلی اللہ
	علیہ وسلم) نے کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا تھا"۔

تعین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان مومنین صادقین کے اس قول کے وقت قرآن مجید کا کون سا مقام اور کونسی آیت ان کے سامنے ہوگی — ویسے قرآن حکیم میں یہ مضمون مختلف اسالیب سے بار بار آیا ہے کہ ہم امتحان لیتے ہیں"— ہم آزماتے ہیں - ہم آزمائیں گے -" سورۃ العنکبوت میں جو مکی سورت ہے اس کے پہلے رکوع میں یہ مضمون خوب واضح طور پر آیا ہے اور یہ رکوع ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے کہ :

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا	کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ
اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ	بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں
لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ	گے کہ "ہم ایمان لائے" اور ان
فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ	کو آزمایا نہ جائے گا ؟ حالاں کہ ہم
فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ	ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے
صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ	ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں اللہ
الْكٰذِبِيْنَ ۝	کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے
(آیات ۲-۳)	کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں ؟

پھر سورہ البقرہ جو مدنی سورت ہے کی آیت ۲۱۴ میں فرمایا :

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا	کیا پھر تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے
الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ	کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل
الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ	جائے گا ، حالانکہ ابھی تم پر وہ
مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ	سب کچھ نہیں گزرا ہے ، جو تم سے

وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ

پہلے ایمان والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں مصیبتیں آئیں ہلا مارے گئے حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔

معلوم ہوا کہ ان آیات کے ذریعہ آزمائش و امتحان سے گزارنے کی اس سُنت ثابتہ سے اہل ایمان کو بہت پہلے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ جس کی بدولت رسُول کے ساتھیوں کو آزمائش و ابتلاء کی بھٹیوں سے گزارا جائے گا تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جُدا کر دیا جائے — لیکن میرے خیال میں هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ کے پس منظر میں سُورۂ بقرہ کی یہ آیات آتی ہیں، جن میں فرمایا گیا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؕ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝

(آیات ۱۵۵ تا ۱۵۷)

اور ہم خوف و خطر، تنگی، فاقہ کشی، جان و مال اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہارا امتحان لیں گے اور تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے"۔ انہیں خوشخبری دیدو، ان پر ان کے ربّ کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی۔ اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی۔ اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ احزاب کی کیفیات سے ان آیات کے ذریعہ

اہل ایمان کو پیشگی مطلع کر دیا گیا تھا - اور ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ کے پس منظر میں یہ آیات بہت نمایاں ہیں اور اہل ایمان کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں اور وہ شعوری طور پر جانتے بھی تھے اور منتظر بھی تھے کہ سخت سے سخت آزمائشیں، امتحانات اور ابتلاء آنے والے ہیں -

میں سیرتِ مطہرہ کی تقاریر میں یہ بات کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ شخصی طور پر "یوم طائف" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سب سے کٹھن دن اور سب سے سخت دن تھا اور یہ تو خود حضورؐ کا مرفوع قول ہے - حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جب دریافت کیا کہ آپؐ پر یوم احد سے زیادہ کوئی سخت دن گزرا ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ "ہاں مجھ پر جو سخت ترین دن گزرا ہے وہ یوم 'طائف' تھا — پس شخصی اعتبار سے حضور کے لئے یوم طائف ابتلاء و آزمائش کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ہے — اور بحیثیت مجموعی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کی جماعت کے لئے غزوۂ احزاب آزمائش کی چوٹی ہے — جس کا نقشہ ہم پچھلے رکوع میں پڑھ چکے ہیں کہ :-

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا — غور کیجئے کہ یہاں بھی وہی انداز ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جب آخری امتحان حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے سے متعلق ہوا تھا - اس میں اس سے زیادہ بڑی شاباش اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ خود ممتحن پکار اٹھے کہ واقعی امتحان بہت کڑا تھا اور تم اس میں کامیاب ہو گئے ہو — اس سے بڑی مبارکباد، اور اس سے بڑی تہنیت ممکن نہیں کہ خود ممتحن کہہ رہا ہو کہ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝ (الصّٰفّٰت ۱۰۴-۱۰۶) میں سمجھتا ہوں کہ 'شاباش' کا اس سے زیادہ بہتر اسلوب ممکن نہیں ہے کہ خود ممتحن پکار اٹھے کہ امتحان فی الواقع سخت تھا — وہی انداز اور اسلوب یہاں ہے کہ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا — یہ کون کہہ رہا ہے - خود ممتحن کہہ رہا ہے - اللہ خود فرما رہا ہے کہ ہم نے

اہلِ ایمان کا کٹھن امتحان لے لیا اور اُن کو خوب جھنجوڑ لیا۔ جب اہلِ ایمان اس امتحان اور آزمائش میں ثابت قدم نکلے تو دشمنانِ دین کے جولشکر بادلوں کی طرح امنڈ کر آئے تھے وہ ایسے چھٹ گئے جیسے تھے ہی نہیں۔ غزوۂ احد میں تو ستر صحابہ شہید ہوئے تھے لیکن یہاں تو کھلے مقابلے کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ ایک دو مرتبہ خندق میں کود جانے والے کفار سے کچھ مبارزتیں ہوئی ہیں اور تیر اندازی سے چند صحابہؓ شہید ہوئے ہیں جن کی تعداد چھ سات سے زیادہ نہیں، اس وقت صحیح تعداد میرے حافظے میں نہیں ہے۔ اس غزوے میں باقاعدہ کھلا مقابلہ تو ہوا ہی نہیں ہے۔ البتہ محاصرہ بڑا شدید اور خطرہ بڑا مہیب تھا کہ محاصرے کی طوالت دشمنانِ اسلام کے لشکر کی تعداد پھر سردی کا عالم اور سامان خورد و نوش کی قلت کی وجہ سے خندق میں موجود صحابہ کرامؓ کو سخت تکالیف و مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ جس کا نقشہ ہم پچھلے رکوع میں پڑھ آئے ہیں کہ: وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ "جب خوف کی وجہ سے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے مُنہ کو آنے لگے"۔ تو ان حالات میں مومنینِ صادقین کی دلی کیفیات اور ان کے صبر و ثبات کا نقشہ اس رکوع میں ہمارے سامنے یہ آیا کہ:۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ○ آیت ۲۲	جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ "یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی" اس واقعہ

نے ان کے ایمان اور تسلیم و رضا کی کیفیات میں مزید اضافہ کر دیا۔

اس کے برعکس منافقین اور ان لوگوں کا جو ضعفِ ایمان کا شکار تھے کیا حال تھا اس کا نقشہ ہم پچھلے رکوع میں پڑھ آئے ہیں۔ فوری تقابل کے لئے ان کی دلی کیفیات سے متعلق آیات پھر دیکھ لیجئے جہاں فرمایا گیا:۔

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ
وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ
رَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ۝
وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ
يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ
لَكُمْ فَارْجِعُوْا ج وَيَسْتَاْذِنُ
فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ
يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا
عَوْرَةٌ ط وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ج
اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝
وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ
اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا
الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا
وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ۝
وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا
اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ
الْاَدْبَارَ ط وَكَانَ عَهْدُ
اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ۝
(آیات ۱۲ تا ۱۵)

اور یاد کرو وہ وقت جب
منافقین اور وہ سب لوگ جن
کے دلوں میں روگ تھا صاف
صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس
کے رسول نے جو وعدے ہم سے
کئے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ
تھے۔ جب ان میں سے ایک
گروہ نے کہا کہ ”اے یثرب کے
لوگو! “تمہارے لئے اب ٹھہرنے
کا کوئی موقع نہیں ہے۔ پلٹ
چلو۔ جب ایک فریق یہ کہہ کر
نبی سے رخصت طلب کر رہا تھا
کہ ہمارے گھر خطرے میں ہیں
حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے۔
دراصل وہ (محاذِ جنگ) سے
بھاگنا چاہتے تھے۔ اگر شہر کے
اطراف سے دشمن گھس آتے
ہوتے اور اس وقت انہیں
فتنے کی طرف دعوت دی جاتی
تو یہ اس میں جا پڑتے اور مشکل
ہی سے انہیں شریک فتنہ ہونے میں کوئی تامل ہوتا۔ ان لوگوں نے اس
سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ پیٹھ نہ پھیریں گے۔ اور اللہ سے کئے
ہوئے عہد کی باز پرس تو ہونی ہی تھی۔

اس امتحان و آزمائش کا نتیجہ یہ نکلا کہ منافقین اور مومنین صادقین علیحدہ
علیحدہ نمایاں ہوگئے۔ غزوۂ احد کے موقع پر جو منافقین راستے ہی سے پلٹ گئے

تھے تو انہوں نے عہد کیا تھا کہ اگر آئندہ آزمائش کا کوئی موقع آیا تو وہ ہرگز پیٹھ نہ پھیریں گے - غزوۂ خندق میں جب احد سے بھی بڑا خطرہ سامنے آیا تو ان منافقین کی پول کھل گئی اور واضح ہو گیا کہ یہ لوگ اپنے اس عہد میں کتنے مخلص اور سچے تھے -- !

جب امتحان مکمل ہو گیا اور مومنینِ صادقین اور منافقین بھی چھٹ کر نمایاں ہو گئے تو نصرتِ الٰہی آئی اور جیسا کہ ہم پچھلے رکوع میں پڑھ چکے ہیں کہ ایک مہینے کے محاصرے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسے نادیدہ لشکر اتارے جنہوں نے دشمنوں کے کیمپ میں کھلبلی ڈال دی، مزید براں اپنی غیبی تائید سے کچھ ایسے حالات پیدا فرما دیئے کہ ان حملہ آوروں کو اسی میں عافیت نظر آئی کہ اپنے ڈیرے اٹھا کر چلتے بنے -

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ○

(آیت ۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یاد کرو - اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی)، اللہ نے تم پر کیا ہے جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیجی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہیں آتی تھیں - اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے -

رات کو پورا لشکر موجود تھا - صبح دیکھا تو میدان خالی پڑا ہے -- رات کی شدید آندھی نے ان لشکروں کے خیموں کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور "نظر نہ آنے والی فوجوں" نے کھلبلی مچا دی اور تمام ہی حملہ آور لشکر صبح طلوع ہونے سے پہلے اپنا بوریا بستر گول کر کے کوچ کر گئے -- نظر نہ آنے والی فوجوں سے مراد وہ مخفی فوجیں اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وہ فرشتے ہیں جو اس کائنات کے نظام اور انسانی معاملات میں اللہ کے حکم سے کام کرتے رہتے ہیں اور انسان ان واقعات و حوادث کو صرف ان کے ظاہری اسباب پر محمول کرتا ہے -- بہرحال

چونکہ اس تمام صورتِ حال کی غرض و غایت دراصل آزمائش و امتحان تھی۔ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔۔ اس میں مخلص اہل ایمان پورے اترے اور انہوں نے منافقین کے قول مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ کے بجائے دلی یقین کے ساتھ کہا تو یہ کہا کہ ؛ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۔۔۔ اس ابتلاء سے نہ وہ ہراساں اور خوف زدہ ہوتے اور نہ ہی ان کے حوصلے پست ہوتے بلکہ ان کی کیفیات یہ تھیں کہ : وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝ " اور اس پوری صورتِ حال نے ان کے ایمان اور ان کی تسلیم و رضا کو اور زیادہ بڑھا دیا اور وہ پورے قلبی اطمینان اور انبساطِ قلب کے ساتھ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کرنے کیلئے تیار ہوگئے۔

آیت کے اس ٹکڑے میں زَادَ کا فاعل دراصل وہ پوری صورت حال ہے۔ جو غزوۂ احزاب میں پیش آئی ۔۔۔ اب دیکھئے کہ یہ آیت اس بات کے لئے بھی نص ہو گئی کہ ایمانِ حقیقی بڑھتا بھی ہے ۔ یہاں کسی ابہام کے بغیر فرمایا گیا ہے۔ کہ اس صورتِ واقعہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مومنین صادقین کے ایمان میں اور اضافہ ہوگیا ۔ ان کی جو کیفیت تسلیم و رضا تھی' وہ بھی اور بڑھ گئی ۔ اور ان کا رویہ یہ ہو گیا کہ ؏ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے ۔ ایمان میں اضافے کا ذکر سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر ۱۷۳ میں بھی غزوۂ احد پر تبصرے کے دوران آیا ہے کہ : اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۔" وہ مومنین صادقین جن سے لوگوں (مراد ہیں منافقین) نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑا لشکر آیا ہے لہٰذا ان سے ڈرو ۔ تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا "۔ یہاں زَادَهُمْ ایمان حقیقی ۔۔۔ اور کامل سپردگی میں اضافے کے لئے آیا ہے ۔۔۔ لہٰذا از روئے قرآن ایمانِ حقیقی کے بڑھنے کی نصوص ہمارے سامنے آگئیں ۔۔ اور جو چیز بڑھ سکتی ہے ۔ وہ گھٹ بھی سکتی ہے ۔

اب چونکہ ایمان کے بڑھنے اور گھٹنے کا ذکر آگیا ہے ۔ تو مجھے اس ضمن میں کچھ وضاحت کرنی پڑے گی ۔ ویسے یہ موضوع ہمارے منتخب نصاب میں

[illegible]

[illegible] جنت [illegible] گی۔ اللہ کو کسی [illegible] کی کوئی [illegible] نہیں ہے۔ یہ دنیوی معاملہ ہے [illegible] — اللہ تو تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے [illegible] دلوں میں کہ یہاں ایمان و یقین ہے یا نہیں — [illegible] سورۃ الحجرات میں فرمایا کہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ — "ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے"۔ اس قلبی اور حقیقی ایمان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ گھٹتا بھی ہے بڑھتا بھی ہے۔ اس دل والے ایمان میں "عمل" ایک جزوِ لازم بن جائے گا۔ اس لئے کہ دل میں ایمان ہوگا تو عمل میں اس کا ظہور لازماً ہوگا — اس اعتبار سے امام بخاری

عنہ اللہ کا یہ قول صدفی صد درست ہے کہ اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ وَّ عَمَلٌ یَزِیْدُ وَ یَنْقُصُ ۔ "ایمان قول وعمل کے مجموعے کا نام ہے یہ بڑھتا بھی ہے اور گھٹتا بھی ہے ۔ یہ ضمنی بحث اس ضمن میں آگئی کہ : وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا ٥ " اور نہیں بڑھایا ان میں مگر ایمان اور تسلیم کو " ایمان قلبی کیفیت اور تسلیم، سپردگی و حوالگی ۔ اسلام اور تسلیم میں کوئی خاص فرق نہیں ہے ۔ اسلام بابِ افعال سے اور تسلیم باب تفعیل ہے ۔ بابِ افعال کا خاصہ ہے کہ ایک دم کوئی کام ہو جائے لہٰذا اسلام کا مطلب ہو گا فوری طور پر خود کو کسی کی سپردگی میں دے دینا ۔ اور باب تفعیل کسی کام کے پے بہ پے اور مسلسل ہونے کی خاصیت کے اظہار کے لئے آتا ہے ۔ لہٰذا تسلیم کا مفہوم ہو گا ہر دم و ہر وقت اور مسلسل اس سپردگی کی کیفیت کو قائم و برقرار رکھنا ۔ ۔ جیسے ہی کسی نے اقرار کیا کہ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ وہ دفعتاً کفر کی سرحد سے اسلام کی سرحد میں آگیا ۔ اس نے ایک پالے سے دوسرے پالے میں دفعتاً چھلانگ لگا دی ۔ اور وہ مسلمان ہو کر مسلم معاشرے کا فرد اور ایک مسلم ریاست کا شہری بن گیا ۔ اس کو ایک مسلمان کے تمام حقوق حاصل ہو گئے ۔ اور یہ بالکل برابر ہوں گے ۔ ان میں کوئی کمی بیشی اس دنیا میں نہیں ہوتی ۔ اسلام کی اس کیفیت کو وثوق حاصل ہو جائے گا اور اس کے طرز عمل میں مسلسل اطاعت شعاری اور فرماں برداری اور سپردگی کا مظاہرہ ہوتا رہے گا تو یہ تسلیم ہے ۔ یہ مصرع اسی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے کہ " سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے " اور فارسی کا یہ شعر بھی اسی کیفیت کا مصداق ہے کہ ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

یہ ہے تسلیم و رضا کی کیفیت آگے فرمایا :

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ	" اہل ایمان میں ایسے لوگ
صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ	موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے
عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى	ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے ۔

نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ — ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی اپنی باری آنے کا منتظر ہے۔ اور ان اہل ایمان نے اپنے رویے اور طرزِ عمل میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں کی۔"

یہ آیت اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ پر غزوۂ احزاب کے پس منظر میں غور و تدبر کیا جائے۔ کاش کہ اس موقع پر میری اور آپ کی زبان اور قلب سے 'آمین' کی کوئی صدا نکل گئی ہو کہ اللہ ہمیں بھی ان میں شامل فرمادے۔ اللہ تعالیٰ ان اہل ایمان کی مدح و ستائش فرما رہا ہے کہ ان میں ایسے بھی جواں مرد اور باہمت لوگ ہیں جو اپنے عہد کو پورا کر چکے — یہاں رجال کا لفظ استعمال ہوا ہے جو رجل کی جمع ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خواتین اس سے خارج ہوگئیں۔ قرآن حکیم میں اہل ایمان کو عمومیت کے ساتھ مذکر کے صیغے میں خطاب کیا گیا ہے۔ ایک بعرض تغلیب ہوتا ہے اور اس میں آپ سے آپ خواتین بھی شامل ہوتی ہیں — یہاں رجالٌ اپنی اس معنویت کے لئے آیا ہے کہ اس دنیا میں شیطانی وساوس سے بچ کر دین پر کاربند رہنا کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ بڑی ہمت اور جواں مردی کا کام ہے — یہی مضمون سورۂ نور کے پانچویں رکوع میں آیا ہے۔ جو ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے کہ:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝ (آیت نمبر ۳۷)

ان میں ایسے باہمت و جواں مرد بھی ہیں، جنہیں تجارت اور خرید فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی۔ وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے اور دیدے پھرا جانے کی نوبت آجائے گی۔

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ کیفیات عورتوں میں نہیں ہو سکتیں۔ خواتین میں امہات المؤمنین ہیں۔ صحابیات ہیں۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ پھر

بڑی بڑی متقی، صالح، صابر، عابد و زاہد اور مجاہد خواتین اُمت میں پیدا ہوتی ہیں۔
ان میں ایک اللہ والی وہ خاتون خنساؓ بھی ہیں، جس کے چار جوان بیٹے حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں ایران کی جنگ قادسیہ میں شہید ہو گئے اور انہوں نے سجدۂ شکر ادا کیا — ایک خاتون وہ بھی ہیں کہ جب غزوۂ احد میں عارضی ہزیمت ہوئی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی افواہ مدینہ تک پہنچی تو وہ بیتابانہ میدان احد میں آتی ہیں۔ ان کو خبر دی جاتی ہے کہ تمہارے والد شہید ہو گئے، وہ پوچھتی ہیں کہ یہ بتاؤ کہ رسول اللہؐ کا کیا حال ہے ان کو خبر دی جاتی ہے کہ باپ شہید ہو گیا کوئی بات نہیں — انؓ سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا شوہر بھی شہید ہو گیا۔ — وہ کہتی ہیں کہ کوئی بات نہیں، مجھے یہ بتاؤ کہ حضورؐ کا کیا حال ہے — ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہارا بیٹا بھی شہید ہو گیا — وہ اللہ کی بندی پوچھتی ہیں کہ مجھے حضورؐ کے بارے میں بتاؤ — اور جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ بخیریت ہیں تو وہ کہتی ہیں — الحمد للہ اس خوش خبری کے آگے سب کچھ ہیچ ہے — باپ شوہر اور بیٹا تو مرتبۂ شہادت پر فائز ہو کر کامران و کامیاب ہو گئے — الغرض بے شمار نظائر ہماری تاریخ میں ایسی خواتین موجود ہیں — وہ جو کہا گیا ہے کہ ؎ خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد —
اس بات کو اس مقام پر ذہن میں رکھئے کہ یہاں رجال سے معنی جواں مرد و باہمت لوگ مراد ہیں۔ خواہ وہ مرد ہوں خواہ عورتیں۔ جن کی کیفیات یہ ہوں کہ:
رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ — جن کو نہ کوئی کاروبار و مصروفیت دنیوی اللہ کی یاد سے روک سکتی ہیں۔ اور نہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ سے۔
دیکھئے کہ ان آیات سے یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ بندۂ مومن کی زندگی کے دو رُخ ہیں — ویسے یہ تمام مباحث و مضامین ہمارے منتخب نصاب میں آجاتے ہیں — ایک طرف اللہ کے ساتھ دلی تعلق اور لگاؤ اور اس میں ثبات — دوسری طرف اللہ کے دین کے لئے جہاد و مجاہدہ اور اس میں صبر و ثبات اور استقلال و استقامت۔ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۷ میں جو

آیت برّ کے نام سے ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے، برّ و تقویٰ کے ضمن میں ایمان کے ساتھ سچے اور حقیقی نیکوکاروں کے دوسرے اوصاف کے ضمن میں یہ اوصاف بھی ہمارے سامنے آتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک صادق اور نیک لوگ وہ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور جب کوئی عہد و معاہدہ کرتے ہیں تو اس کو پورا کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں تنگی اور مصیبت نیز جہاد اور قتال کے موقع پر انتہائی صبر کرنے اور ثابت قدم رہنے والے ہوتے ہیں - وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ — ایک بندہ مومن کی زندگی کی یہ دو شکلیں ہیں - پہلی شکل میں بھی بڑی ہمت اور قوت ارادی کی ضرورت ہے اور دوسری شکل میں بھی انتہائی صبر و استقلال کی ضرورت ہے لہٰذا یہاں فرمایا: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ - اہل ایمان میں وہ جواں مرد اور باہمت لوگ بھی ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا اس عہد کو جو انہوں نے اپنے اللہ سے کیا تھا -

اب غور کیجئے کہ یہ عہد کون سا ہے؟ اسلام خود ایک بہت بڑا عہد ہے پھر ہم نماز کی ہر رکعت میں اس کا اقرار اور اس کی تجدید کرتے ہیں کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ - اللہ کے ساتھ اس سے بڑا کوئی عہد ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور صرف تجھ ہی سے طالب اعانت و دستگیری ہیں اور رہیں گے — ہم نے اپنا سب کچھ تیرے سپرد اور تیرے حوالے کر دیا ہے - سپردم بتو مایۂ خویش را — اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ — "بلاشبہ اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے عوض خرید لیے ہیں" اب اس سودے میں پورے اتر کر دکھاؤ — کہنے کو کہہ دیا - پڑھنے کو پڑھ لیا، سننے کو سن لیا لیکن پورا اتر کر دکھانا قیامت ہے - قیامت تو وہاں ٹوٹتی ہے جہاں مال خرچ کرنے کا وقت آئے - تو ہم کہتے ہیں، ہمارا مال — اللہ کا مال

تو نہ کہا اور نہ ہم نے سمجھا --- کہنے کو تو شاعر نے بھی کہہ دیا کہ ؎

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

لیکن اس پر پورا اترنا کوئی آسان بات نہیں --- پس یہاں ان اہل ایمان کی مدح و ستائش ہو رہی ہے۔ جنہوں نے اس آزمائش و ابتلاء میں اپنے آپ کو پورا اتول کر دکھا دیا --- لہٰذا ان کی شان میں فرمایا: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ --- آگے فرمایا: فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ "پس ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے" یعنی اللہ کی راہ میں جان دے کر فارغ ہوتے، سرخرو اور سبک دوش ہو گئے --- وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ۔ اور ان میں وہ بھی ہیں جو اس بات کے منتظر ہیں کہ کب وہ وقت آئے جب ہم اپنے اس عہد کو پورا کر کے سرخرو ہو جائیں اور اپنے شانوں پر رکھا ہوا بوجھ اتار کر سبک دوش ہو جائیں --- اگر گردن کٹ گئی تو شانوں کا بوجھ اتر گیا اور سبک دوشی حاصل ہو گئی --- پچھلے دنوں قرآن اکیڈمی میں درس حدیث کے سلسلے میں وہ حدیث زیر درس آئی ، جس میں نبی اکرم ؐ نے فرمایا کہ "جو بندۂ مومن صدق دل سے اللہ سے شہادت طلب کرتا رہے گا تو چاہے اس کی موت بستر پر واقع ہو اللہ کے ہاں وہ شہید ہی شمار ہو گا (او کما قال صلے اللہ علیہ وسلم) یہ اصل میں يَنْتَظِرُ والی کیفیت کی ایک طرح کی شرح ہے۔ البتہ اس انتظار کی کیفیات اور شرائط ہوں گی --- قتال کا مرحلہ کیسے آئے گا جبکہ آپ نے جہاد ہی کی کوشش شروع نہیں کی۔ آپ نے دین کے لئے محنت و مشقت کے میدان میں قدم ہی نہیں رکھا۔ آپ اقامتِ دین کے لئے جدوجہد کرنے والی کسی تنظیم و جماعت سے وابستہ ہی نہیں ہوئے تو پھر قتال کا مرحلہ کہاں سے آجائے گا جو جہاد کی آخری اور چوٹی کی منزل ہے۔ یہ تو اس وقت مرحلہ آسکے گا جب آپ کسی ایسی منظم دعوت اور تحریک سے عملاً وابستہ ہوں جو اقامت دین کے لئے کوشاں ہو --- غور کیجئے ایسے بھی تو صحابہ کرام رضؓ ہوں گے جن کا ہجرت سے قبل انتقال ہو گیا ہو گا لیکن وہ اس دعوت و تبلیغ اور تکبیر رب میں نبی اکرم ؐ کے دست و بازو رہے ہیں۔ اپنی جانیں ، اپنا مال اپنے اوقات اپنی توانائیاں اور اپنی صلاحیتیں لگاتے رہے ہیں کھپاتے رہے ہیں --- وہ اگر غزوۂ بدر یا احد تک پہنچ گئے ہوتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ ان کے قدم پیچھے ہٹ جاتے! لیکن ان کا سابقہ طرز عمل

ثابت کرے گا کہ وہ اپنے موقف میں کتنے ثابت قدم اور سرگرم عمل رہے ہیں۔ کوئی قدم قدم پر پیچھے ہٹ رہا ہو اور پیسے پیسے کو سینت سینت کر رکھ رہا ہو تو کیسے ممکن ہے کہ اگر کبھی وقت کا تقاضا ہو تو وہ جان و مال کی بازی لگا دیگا۔ — پس صدقِ دل سے ایک بندۂ مومن شہادت کا طالب ہو اور تمنا کرے کہ اللہ کی راہ میں نذرِ جاں پیش کرنے کی اس کو سعادت ملے تو اسکی زندگی میں اس کے عملی مظاہرے ہونے لازم و لابد ہوں گے — اگر وہ جہاد فی سبیل اللہ کی وادی میں قدم رکھ چکا ہے اور شہادت کا طلبگار بھی ہے تو وہ اس بات کی توقع رکھے کہ اگر بستر پر بھی اسکی موت آئے تو اُسے مرتبۂ شہادت مل سکے گا — اس کی مثال ایسی ہے کہ جس نے کاغان کا سفر شروع کیا ہے تو بابو سر پاس تک بھی پہنچنے کا امکان ہوگا۔ لیکن اگر کوئی بالاکوٹ سے آگے بڑھنے اور وادیٔ کاغان میں قدم رکھنے کے لئے ہی تیار نہیں تو بابو سر پاس کب آئے گا! بیٹھے بیٹھے بابو سر پاس کی تمنا کرتے رہنا تو وہ تو سوائے اپنے آپ کو دھوکا دینے کے اور کچھ نہیں — یہ تو ایسا ہی ہے کہ ؎ خود را بہ فریبد کہ خدا را بہ فریبد — ایسا شخص خود اپنے آپ کو فریب دے رہا ہے یا خدا کو فریب دے رہا ہے — علامہ اقبال مرحوم نے خوب کہا ہے کہ ؎

عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانا
خبر نہیں نام کیا ہے اِس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی

تو اس دھوکے کے انداز میں شہادت کی تمنا نہ ہو بلکہ عمل کے ساتھ صدقِ دل سے ہو تو بستر کی موت بھی ان شاء اللہ العزیز شہادت کی موت ہوگی — حضرت خالد ابن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موت بستر پر آئی ہے۔ جن کی زندگی ہمیشہ جنگوں کے اندر بیتی ہے لیکن موت بستر پر آئی ہے — اس میں یہ حکمت بھی ہو سکتی ہے کہ آں جنابؓ کو "سیفٌ من سیوف اللہ" کا خطاب بارگاہِ رسالت مآبؐ سے ملا تھا۔ اس لئے شہادت ایک نوع سے اللہ کی تلوار کے ٹوٹنے کے مترادف ہوتی — انؓ کو شہادت کی موت کی بڑی تمنا تھی اور اسلام لانے کے بعد ان کی زندگی جہاد و قتال میں گزری ہے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک اور نوید کے مطابق انکی بستر کی موت بھی شہادت کی موت ہے کہ جس دل میں صدقِ دل سے شہادت کی آرزو و تمنا ہوگی، اسکی بستر کی موت بھی شہادت کی موت ہوگی۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا: وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا ۝ "انہوں نے اپنے رویے میں سرمو تبدیلی نہیں کی"۔ "تبدیلاً" یہاں مفعول مطلق کے طور پر آیا ہے تو اس میں مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ یعنی ان اہل ایمان نے بالکلیہ اپنے عہد اور وعدے کو ایفا کیا اور اس میں سرمو تبدیلی نہیں کی بلکہ اس کو پوری طرح نبایا ہے — اور یہ جان لیجئے، پہلے بھی میں نے عرض کیا ہے کہ ہمارے اور اس معاشرے میں بڑا بنیادی فرق یہی تھا۔ وہ عہد کے سچے تھے اور ہم عہد کرتے ہیں اور اس کا ایفاء نہیں کرتے اور اسکو نہیں نباہتے۔ ہم بیعت کرتے ہیں اور توڑ دیتے ہیں — ابھی عہد کریں گے اور ہاتھ میں ہاتھ دیں گے لیکن دو دن کے اندر اس کو توڑ دیں گے۔ یہ جو ہمارے کردار میں گھن لگ گیا ہے اسی کے سبب سے ہماری شخصیتیں کھوکھلی ہو چکی ہیں — اُس معاشرے کی کیفیت یہ تھی کہ ہاتھ میں ہاتھ دیدیا ہے تو ہر چہ باد اباد عہد کو ایفا کرنا اور نباہنا ہے۔ پیچھے ہٹنے کا کوئی سوال نہیں۔ یہ کردار اس معاشرے میں ایام جاہلیت میں بھی موجود تھا — لوگ بڑی زیادتی کرتے ہیں کہ اس دور کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ جیسے اس معاشرے میں ظہور اسلام سے قبل سرے سے کوئی خیر تھا ہی نہیں — میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اس بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے سے بہت اعتبارات سے وہ معاشرہ کہیں بہتر تھا۔ ان کے ہاں اگر کوئی مہمان کے طور پر مقیم ہو گیا ہے اور وہ باپ کا قاتل بھی ہے تو اس پر آنچ نہیں آئے گی اور اس حالت میں انتقام نہیں لیا جائے گا۔ جسے بھائی کہہ دیا ہے اس کے لئے جان و مال سب حاضر ہے۔ جس کو پناہ دے دی ہے اس کے لئے پورے قبیلے کی مخالفت گوارا کر لی جائے گی اور اس کی مدافعت میں اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔ وہاں حال یہ تھا کہ جس کی اطاعت قبول کر لی ہے، اب اس اطاعت سے کبھی سرتابی نہیں کی جائے گی — یہ بنیادی کردار ہوتا ہے۔ ہم اس وقت جن اسباب کی بنا پر دنیا میں رُل رہے اور پامال ہو رہے ہیں اور ہمارا کوئی وقار نہیں ہے اور کوئی باعزت مقام ہمیں حاصل نہیں ہے تو اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ہمارا کردار پست ہو چکا ہے اور ہم بنیادی اخلاقیات سے بھی تہی دست ہو چکے ہیں۔ اِلّا ماشاءاللہ — نمازیوں کی کمی نہیں ہے۔ کافی تعداد موجود ہے — اصل وجہ یہ ہے کہ کردار میں پختگی نہیں ہے بلکہ انتہائی بودا پن موجود

ہے - عہد کر کے نباہنے اور اس کو وفا کرنے کی خواہ ارادہ نہیں ہے - جھوٹے وعدے ہم کرتے ہیں اور اچھے اچھے اور بڑے بڑے سمجھدار لوگ اس کمزوری میں مبتلا ہیں - یہ ہے ہمارے کردار کی ناپختگی اور بودے پن کا بہت بڑا سبب - ہمارے دین میں عہد کے ایفا کی جو اہمیت ہے اس کا تفصیل سے ذکر ہمارے منتخب نصاب میں متعدد بار آتا ہے - جیسے آیت بر (سورۃ بقرہ آیت ۱۷۷) کے درس میں اہل بر و تقویٰ کے اوصاف کے ضمن میں آتا ہے کہ: وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۔ سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے رکوع کے درس میں بیان ہوتا ہے کہ: وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۔ اسی طرح سورۃ المومنون کے پہلے رکوع کی آیت ۸ اور سورۂ المعارج کے پہلے رکوع کی آیت نمبر ۳۲ میں ایک شوشے کے فرق کے بغیر امانت اور عہد کے متعلق مومنین صالحین کے اوصاف کے ضمن میں آتا ہے کہ: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۔ "اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کی پوری طرح حفاظت کرنے والے ہیں" (وہی فلاح یافتہ ہیں) یہ ہے کردار کی ایک اہم ترین بنیاد کہ اہل ایمان اپنے عہد و پیمان اور قول و قرار کو وفا کرنے والے اور انکو پورا کرنے والے ہوتے ہیں - میں نے اب تک جو توضیح و تشریح کی ہے، اسکی روشنی میں اس آیت کو پھر ایک بار دیکھ لیجئے - پھر ہم آگے بڑھیں گے - فرمایا: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۔

ان مؤمنین صادقین کی اس استقامت و مصابرت کا جو نتیجہ نکلا اس کو اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے - فرمایا: لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ - یہاں لام، لام عاقبت ہے یعنی کسی کام کا جو نتیجہ نکلتا ہے، اسے بیان کیا جا رہا ہے - میں نے اس صورت حال کے متعلق آپ کو بتایا تھا کہ یہ کڑا امتحان اس لئے لیا گیا تھا کہ جدا کر کے اور نمایاں کر کے دکھا دیا جائے کہ کون لوگ مومنین صادقین ہیں؟ کون لوگ ضعفِ ایمان میں مبتلا ہیں اور کون لوگ منافقین ہیں - یہی تمیز کرنی تھی اور یہ تمیز اس لئے تھی کہ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ - یہاں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ ہمارے دین میں صدق کا کیا مقام اور کیا رتبہ اور مرتبہ ہے - اس کی اہمیت ہمارے منتخب نصاب کے آیت بر

میں نیکوکار بندوں کے متعدد اوصاف بیان کرکے آخر میں فرمایا گیا کہ

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝	"حقیقی نیکوکار تو وہ لوگ ہیں جو تنگی اور مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کرنے والے ہوں۔ اور یہی لوگ اپنے دعویٰ

ایمان میں سچے ہیں اور یہی لوگ درحقیقت متقی ہیں۔"

سورہ توبہ کی آیت نمبر ۱۱۹ میں فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ۝	"اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے لوگوں میں شامل ہو جاؤ"

صدیقین کے اوصاف میں سے چوٹی کے دو اوصاف یہ ہیں کہ وہ ہر حال میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والے اور مصیبت و ابتلاء میں اور میدان قتال وغیٰ میں استقامت و مصابرت کا مظاہرہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ اسی لئے سورہ النساء کی آیت نمبر ۶۹ میں منعم علیہم کی فہرست میں نبیین کے بعد صدیقین ہی کا رتبہ اور مقام بیان کیا گیا ہے۔ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ۔ اس صدق کی بنیاد یہی ہے کہ قول میں سچے ہوں' وعدوں میں سچے ہوں' عمل میں سچے ہوں ــــ اگر راست گفتاری نہیں ہے' راست بازی نہیں ہے' راست کرداری نہیں ہے تو نہ تقویٰ ہے اور نہ نیکی ہے۔ اس کے بغیر دین کا ڈھانچہ بے جان اور غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔ ایسا معاشرہ بے وقعت و بے روح ہوتا ہے۔ یہ اپنے پیروں پر کھڑا ہی نہیں ہو سکتا۔ ایسے معاشرے کے افراد صرف نمائشی پہلوان ہوتے ہیں جو نظر آتے ہیں لہٰذا ہمارے معاشرے میں بھی دین محض بطور نمائش شامل ہے' اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ معاشرہ صدق کی دولت سے تہی دامن اور تہی دست ہے۔ یہ پونجی اور یہ سرمایہ اس کے پاس سے نکل چکا ہے۔ اس پہلو سے وہ بالکل دیوالیہ ہو چکا ہے۔ اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰه۔ کچھ لوگ ہوں گے جن کے پاس کچھ پونجی موجود ہو۔

حالانکہ ہمارے دین کا شدید ترین مطالبہ یہ ہے کہ جو کہہ رہے ہو اس کو عمل سے سچ کر دکھاؤ جو تمہارے اندر ہے وہی باہر لاؤ۔ چنانچہ سورہ الصف میں جو ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے دوٹوک انداز میں فرمادیا گیا ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا	"اے اہل ایمان! تم وہ بات کیوں کہتے

لَا تَفْعَلُوْنَ ○ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ○

ہو جو کرتے نہیں ہو ؟ اللہ کے نزدیک یہ حرکت سخت ناپسندیدہ اور بیزار کن اور اس کے غضب کا باعث ہے کہ تم وہ بات کہو جس کے مطابق تمہارا عمل نہیں۔ اللہ کو تو وہ اہلِ ایمان محبوب ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر مقابلہ کرتے ہیں جیسے وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔"

یہ ہے دراصل صدق کی بنیاد ـــ صدق قول کا بھی ہے۔ صدق عمل کا بھی ہے۔ صدق انسان کی سیرت و کردار کا بھی ہے۔ صدق بوقت ضرورت اللہ کی راہ میں نقدِ جان کا نذرانہ پیش کرنا بھی ہے۔ اب ان آیات میں صدق کی اہمیت دیکھئے۔ فرمایا:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ

"اہلِ ایمان میں وہ باہمت لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچ کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی اپنی باری کا منتظر ہے۔ (یہ اس لئے ہوا کہ اللہ مؤمنین صادقین کو ان کی سچائی کی جزا دے۔"

آگے فرمایا:

وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○

"اور منافقین کو اگر چاہے تو سزا دے یا اگر چاہے تو ان کو توبہ کی توفیق عطا فرما دے اور ان کی توبہ قبول فرمالے۔ بے شک اللہ غفور اور رحیم ہے۔"

غزوۂ احزاب ۵ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ یہ زمانہ مدنی دور کا وسط ہے۔ منافقین کے باب میں آپ کو قرآن مجید میں یہ تدریج نظر آئے گی کہ شروع میں یعنی سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران میں لفظ نفاق آیا ہی نہیں۔ صرف اس نفاق کے مرض کی علامات ظاہر کی گئیں سورہ النساء میں لفظ نفاق کے ساتھ سخت لہجہ اور اسلوب میں گفتگو شروع ہوتی ہے ـــ یہاں یہ معاملہ ہے کہ منافقین کا کردار تو واضح طور پر بیان اور نمایاں کر دیا گیا لیکن ان کے

رویے کے متعلق آخری فیصلہ ابھی نہیں سنایا گیا۔ تاکہ اگر کسی کے اندر اصلاح پذیری کا کوئی مادّہ اور رمق موجود ہے تو وہ اصلاح کر لے۔ کوئی اگر نفاق کی حالت سے لوٹ سکتا ہے، تو لوٹ آئے۔ کوئی اگر ایمانِ صادق کی طرف رجوع کر سکتا ہے تو کر لے۔ دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے۔ لیکن آگے جا کر آخری احکام اور فیصلے آئے ہیں جن میں سے ایک فیصلہ تو سورہ النساء میں شامل کیا گیا کہ: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝ (آیت ۱۴۵) اور سورہ توبہ (براءۃ) میں جو ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے موقع پر نازل ہوئی جس میں مختلف مقامات پر مختلف اسالیب سے ان منافقین کی اصل حقیقت کھول کر یہ فیصلے صادر فرما دیئے گئے کہ:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ (آیت ۶۸)

"منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں کے لئے اللہ نے آتشِ دوزخ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ان کے لئے موزون ٹھکانہ ہے۔ ان پر اللہ کی پھٹکار ہے اور ان کے لئے قائم و دائم رہنے والا عذاب ہے۔"

آگے یہاں تک فرما دیا گیا کہ:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (آیت نمبر ۸۰)

"اے نبیؐ! آپ خواہ ایسے لوگوں کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں، اگر آپؐ ستر بار بھی ان کو معاف کر دینے کی درخواست کریں گے تب بھی اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے اور اللہ فاسقوں کو راہ یاب نہیں فرماتا۔"

حضورؐ کا اپنا مزاج ہے۔ آپؐ رؤف بھی ہیں اور رحیم بھی۔ لہٰذا آپ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ستر سے زیادہ استغفار کرنے سے ان کی مغفرت ہو سکتی ہے تو میں کرتا ـــــ نبی اکرمؐ کے اس قول کا کیا مطلب ہوا؟ یہ کہ یہاں ستر سے مراد عدد یا ہندسہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک استعارہ ہے۔ یہاں ستر کا لفظ کثرت کے لئے آیا ہے کہ اب ان کے

لئے توبہ کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ ان کو بار بار متوجہ کیا گیا، تقریباً دس سال بیت گئے۔ ان کو اصلاح کا پورا پورا موقع دیا گیا ـــــ اس مقام پر ہی دیکھ لیجئے کتنے پیارے انداز میں فرمایا گیا: وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ مومنینِ صادقین کے لئے تو قطعیت کے ساتھ فرمایا گیا: لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ لیکن منافقین کے لئے توبہ کرنے اور اپنے رویئے کی اصلاح کرنے کا موقع رکھا گیا اور ان کو مہلت دی گئی کہ ابھی ان کے بارے میں قطعیت کے ساتھ فیصلے کا وقت نہیں آیا ہے۔ ابھی ان کے لئے راستہ کھلا رکھا گیا ہے۔ چونکہ ان کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے لہٰذا یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ غفوریت اور رحمانیت کا بیان فرما دیا تاکہ منافقین بالکل مایوس نہ ہو جائیں۔ گویا کہ ان کو دعوت دی جا رہی ہے کہ آؤ۔ لوٹو اور رجوع کرو ؎

باز آ باز آ ہر آں چہ ہستی باز آ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست! صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اب آگے چلئے۔ فرمایا: وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ اور اللہ نے کفار کا منہ پھیر دیا۔ اور وہ اپنے دل کی جلن اور غصہ و غیظ لئے یونہی پلٹ گئے اور ان کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ؕ اب غور کیجئے کہ ان کفار کو کیا کیا حسرتیں ہوئی ہوں گی؟ کیسے کیسے ساز و سامان کے ساتھ اور کیسی کیسی سازشوں کے نتیجے میں اتنی مختلف سمتوں سے لشکروں کا ایک جگہ آکر جمع ہو جانا! اس کے لئے کیا کیا کھکیڑ مول لئے ہوں گے؟ کتنی سفارتی بھاگ دوڑ ادھر سے ادھر ہوئی ہو گی۔ کتنے ایلچی آئے اور گئے ہوں گے؟ کتنے پروگرام بنے ہوں گے؟ وہ کوئی ٹیلی کمیونیکیشن کا دور تو نہیں تھا۔ اس زمانے کے عرب میں اس حملے کی تیاری اور پروگرام بنانے کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلے گئے ہوں گے؟ ذرا ان کا تصور تو کیجئے! لیکن ان تمام کوششوں اور متحدہ محاذ کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے خیمے اکھاڑ کر جانے پر مجبور ہو گئے۔ تو دلوں میں غیظ و غضب کی جو آگ سلگ رہی تھی اس پر اللہ تعالیٰ تبصرہ فرما رہا ہے۔ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ؕ ـــــ اللہ تعالیٰ نے ان کفار کو ان کے غیظ و غضب سمیت لوٹا دیا، اب وہ اس میں سلگیں اور جلیں گویا ان کے دل آگ کی بھٹی بنا دیئے گئے ـــــ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ـــ وہ کوئی خیر نہ پا سکے۔ وہ کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اور کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ بغیر اس کے کہ اپنے مقاصد میں سے کچھ بھی

انہیں ملا ہوتا' وہ ناکام و خاسر ہو کر لوٹا دیئے گئے ـــــــ اسی آیت میں آگے فرمایا:

وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۚ "اور اللہ کافی ہو گیا اہلِ ایمان کی طرف سے قتال کے لئے"

قتال کا تو موقعہ ہی نہیں آیا۔ خندق میں کبھی کوئی کود آیا ہے اور مبارزت طلبی کے بعد واصلِ جہنم ہوا۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا! سیرتِ مطہرہ کی کتب میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے پوری کوشش کی تھی لیکن ان کی خندق میں لشکر اتارنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ چونکہ مسلمان تیر اندازوں نے اپنے تیروں کی بوچھاڑ سے ان کو ہزیمت پر مجبور کر دیا۔ لہٰذا اس غزوے میں دو بدو گھمسان کی جنگ جیسے بدر میں ہوئی اور اُحد میں ہوئی ایسی جنگ کا تو موقعہ ہی نہیں آیا۔ یہ جنگ تو اللہ نے مسلمانوں کے لئے جیت لی۔ اصل میں تو مسلمانوں کا امتحان مقصود تھا' وہ ہو گیا۔ دودھ اور پانی یعنی اہلِ ایمان اور اہلِ نفاق جُدا جُدا ہو کر نمایاں اور ممیز ہو گئے۔ بس یہی مطلوب تھا۔ اب کفار کے لشکروں کے منہ موڑنے کیلئے اللہ کافی ہو گیا ـــــــ یہ آیت مبارکہ ان پُرجلال و پُرہیبت اسلوب سے ختم ہوتی ہے کہ: وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۝ اس سے پہلے کی آیت میں در توبہ وا رکھا گیا تھا لہٰذا وہاں صفات کونسی آئیں؟ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ یہاں اس امر کا ذکر ہوا کہ ان تمام احزاب کے لئے اللہ کافی ہو گیا تو یہاں اس مناسبت سے اللہ کی کونسی صفات آئیں؟ قَوِيًّا عَزِيْزًا۔ آیات کے آخر میں بالعموم اللہ کی جو صفات یا اسماءِ حسنٰی آتے ہیں' ان کا مضمون سے گہرا ربط و تعلق ہوتا ہے۔ ان پر سے سرسری طور پر گذرنا نہیں چاہیئے۔ یہاں دو صفات کی وساطت سے بتایا جا رہا ہے کہ اللہ بڑی قوت والا اور زبردست اختیار و اقتدار رکھنے والا ہے۔ اس کی ذات والا صفات فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ہے۔ وہ جو چاہے کر گزرتا ہے۔ یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ عرب کے مشرکین قبائل اور یہود کے دو قبیلے متحدہ محاذ بنا کر اسلامی تحریک کو بالکلیہ نیست و نابود کرنے کے لئے مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے تھے۔ لیکن تقریباً ایک ماہ کے طویل محاصرے کے بعد قدرتِ الٰہی کا کرشمہ یہ ظاہر ہوا کہ ایک رات سخت آندھی آئی جس میں سردی اور کڑک اور چمک تھی اور اتنا اندھیرا تھا کہ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کا نقشہ تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دیتا تھا۔ آندھی نے دشمنوں کے خیمے تلپٹ کر دیئے تھے۔ اور ان کے اندر شدید

افراتفری مچ گئی تھی۔ مشرکین عرب کا یہ متحدہ محاذ قدرتِ الٰہی کا یہ کاری وار سہہ نہ سکا اور صبح صادق سے قبل ہی ہر ایک نے اپنی اپنی راہ پکڑی۔ صبح جب مسلمان اٹھے تو میدان خالی تھا جس کو دیکھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تاریخی الفاظ ارشاد فرمائے تھے:

لن تغزوکم قریش بعد عامکم — "اب قریش تم پر کبھی چڑھائی نہ کرسکیں

ھٰذا ولٰکنکم تغزونھم — گے بلکہ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے۔"

آگے چلئے! اس رکوع کی آخری دو آیات میں غزوۂ احزاب کا جو ضمیمہ اور تتمہ مذکور ہے یعنی غزوہ بنی قریظہ کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا اس کا نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ ان دو آیات میں ذکر ہے۔ سیرت کی کتابوں میں اس کو علیحدہ عنوان کے تحت بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں اس کا علیحدہ ذکر کرنے کے بجائے غزوۂ احزاب کے ضمن میں اس کا یہاں ایک Appendix کے طور پر ذکر کیا گیا ہے ____ ان دو آیات کے مطالعے سے قبل حضورؐ کی تشریف آوری کے وقت مدینہ منورہ میں یہود کے جو تین قبیلے آباد تھے ان کے متعلق تھوڑا سا نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر لیجئے۔ یہ قبیلے تھے۔ بنو قینقاع۔ بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال تدبر یہ تھا کہ مدینہ تشریف آوری کے فوراً بعد آپؐ نے ان تینوں قبائل کو ایک معاہدے کا پابند کر لیا تھا۔ حضورؐ کی اس کمال فراست کو میں جو بھی خراج تحسین پیش کروں گا وہ عقیدت میں شمار ہو سکتا ہے۔ اس تدبر و فراست پر مستشرقین کمال درجہ کا خراج تحسین پیش کر چکے ہیں۔ وہ ایچ جی ویلز ہوں، وہ منٹگمری واٹ ہوں اور دوسرے مستشرقین ہوں انہوں نے حضورؐ کے کمال تدبر اور پیش بینی کی جو مدح سرائی کی ہے وہ کافی ہے۔ اصل تعریف وشہادت تو وہ ہے جو اعداء دیں۔ مدینہ میں بسنے والے اوس و خزرج کے اکثر لوگ ایمان لے آئے تھے۔ یہی دو قبیلے اصلاً مدینہ کے رہنے والے تھے۔ یہود تو باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے ____ اوس و خزرج کی دعوت ہی پر باذن الٰہی حضورؐ نے مدینہ ہجرت فرمائی تھی۔ لہٰذا حضورؐ آپ سے آپ مدینہ کے مقتدر اعلیٰ، امیر، حاکم جو چاہیں قرار دے لیں، ہو گئے۔ آپؐ نے ان یہودی قبائل کو اس معاہدے میں جکڑ لیا کہ اگر باہر سے مدینہ پر کوئی حملہ آور ہوا تو سب مل کر دفاع کریں گے۔ یہ معاہدہ تھا جو یہود کے گلے کا طوق بن گیا۔ یہ معاہدہ نہ ہوتا تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔ میں شاید ہی کہہ رہا ہوں۔ واللہ اعلم۔

اہی جگہ پر ایک دوسری بات بھی قابل توجہ ہے وہ یہ کہ مسلمان قوم جب بگڑتی ہے تو دوقعہ یہ ہے کہ اس کے اندر وھن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لفظ وہن کی حضورؐ نے تشریح یوں فرمائی ہے کہ اس میں حب الدنیا وکراھیت الموت پیدا ہو جاتی ہے پھر وہ مشرکین کے مقابلہ میں کمزور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہود اس وقت کی بگڑی ہوئی مسلمان قوم تھی۔ ان کے اندر وہ ضعف تھا کہ جب اللہ نے چاہا اور ہم سورۂ حشر کے مطالعہ تک پہنچے تو وہاں ہم پڑھیں گے کہ وہاں ان یہودیوں کے متعلق فرمادیا گیا ہے:

لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِیْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ	"یہ یہود کبھی اکٹھے ہو کر کھلے میدان میں اے مسلمانو!) تمہارا مقابلہ نہیں کریں گے' لڑیں گے بھی تو قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر"

ان یہودیوں کے برعکس مشرکین نے کھلے میدانوں میں آکر جنگ کی ہے۔ ابوجہل نے جنگ میں اپنے معبودان باطل اور اپنے اوہام کے لئے دو بدو ہو کر اور لڑ کر گردن کٹوائی۔ یہ نہیں کر سکیں گے۔ یہ یہود جب لڑیں گے تو فصیلوں پر چڑھ کر عورتوں کیطرح پتھراؤ کریں گے۔ پھر یہ آپس کی مخالفت میں بڑے سخت ہیں: بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ تم ان کو اکٹھا سمجھتے ہو حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوتے ہیں۔ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ (آیت نمبر۱۴) لہٰذا تم ان سے گھبراؤ نہیں۔ بظاہر ان کی جمعیت بہت مرعوب کن ہے' یہ بہت پیسے والے ہیں' ساز و سامان بھی ان کے پاس وافر موجود ہے۔ اسلحہ بھی ان کے پاس بہت ہے۔ ان کے پاس گڑھیاں ہیں' قلعے ہیں۔ پس صورت واقعہ یہ تھی کہ یہ اندر سے اتنے بودے تھے کہ ان میں میدان میں آکر لڑنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ پھر ان تمام کمزوریوں کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو معاہدے میں جکڑ لیا تھا۔ اب یہ ہوا کہ یہ مختلف مواقع پر اس معاہدے پر تلملاتے رہے۔ ان میں سب سے زیادہ شجاع بنو قینقاع تھے۔ آہن گری اور زرگری کے پیشے کے اعتبار سے ان کے پاس پیسہ بھی بہت تھا اور سامان حرب اسلحہ وغیرہ بھی کافی تھا ــــــ غزوہ بدر کے بعد سب سے پہلے تو ان کی طرف سے نقض عہد ہوا۔ اور اس معاہدے کی خلاف ورزی ہوئی اور حضورؐ نے فوراً اقدام فرمایا اور ان کو مدینہ بدر ہونا پڑا ــــــ یہ پہلا معاملہ تھا' نبی اکرمؐ

نے ان کے ساتھ بڑی رعایت برتی۔ ان کو اپنا تمام ساز و سامان لے جانے کی اجازت دے دی اور وہ اونٹوں پر اپنا تمام اسباب لاد کر گاتے بجاتے ایک جشن کی صورت میں مدینہ سے نکلے۔ یہ پہلا معاملہ تو ۲ھ میں بدر کے بعد بنو قینقاع کے ساتھ ہو گیا۔ غزوہ اُحُد کے بعد یہی معاملہ بنو نضیر کے ساتھ پیش آیا۔ اُحُد میں مسلمانوں کی عارضی ہزیمت سے ان کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ اور یہ قبیلہ دلیر ہو کر مسلسل بدعہدیاں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش تک کر ڈالی۔ نبی اکرمؐ نے اس قبیلے کو بھی مدینہ بدر کر دیا اور یہ دونوں قبیلے خیبر کے آس پاس جا کر آباد ہو گئے۔ جہاں یہودی پہلے سے آباد تھے اور انہوں نے بڑی مضبوط قلعہ بندیاں کر رکھی تھیں ــــ ان دونوں قبیلوں کو اسلام اور حضورؐ سے دلی عداوت تو پہلے ہی سے تھی۔ مدینہ سے اس جلاوطنی نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور یہ قبیلے خیبر میں بیٹھ کر مسلمانوں کے خلاف عرب کے مشرک قبائل کو بھڑکانے اور مدینہ پر چڑھائی کرنے پر اکسانے اور آمادہ کرنے کے سلسلے میں مسلسل سازشیں کرتے رہے۔ ان کے سردار، ان کے شعراء اور ان کے خطیب مشرکین کے قبیلوں میں جا کر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے رہے۔ چنانچہ ۵ھ میں غزوہ احزاب میں ہر چہار سمت سے عرب کے مشرک قبائل نے مدینہ پر جو یلغار کی وہ انہی یہود کی سازش کا نتیجہ تھی اور اس یلغار کی نقشہ بندی میں بھی یہی یہودی پیش پیش تھے۔ اس موقع پر جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، حملہ آور لشکروں کی تعداد تقریباً بارہ ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھی۔ مسلمانوں کے خلاف اتنی بڑی جمعیت اس سے قبل کبھی جمع نہیں ہوئی تھی۔ اگر یہ حملہ اچانک ہوتا تو سخت نقصان دہ اور تباہ کن ہوتا۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ آپؐ کو دشمنوں کی نقل و حرکت کی برابر اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ آپؐ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے پر دفاع کے لئے جبل اُحُد کے مشرقی اور مغربی گوشوں میں خندق کھدوا کر شہر کو محفوظ کر لیا۔ چونکہ مدینہ کی جغرافیائی پوزیشن ایسی تھی کہ اسی طرف سے حملہ ہو سکتا تھا۔ بقیہ سمتوں میں قدرتی رکاوٹیں موجود تھیں۔ کفار و مشرکین اس طریقِ دفاع سے ناآشنا تھے ناچار انہیں جاڑے کے موسم میں ایک طویل محاصرے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ جس کے لئے وہ تیار ہو کر اپنے ٹھکانوں سے نہیں آئے تھے۔ اب ان کے لئے ایک ہی چارہ کار رہ گیا تھا کہ وہ بنو قریظہ کے یہودی قبیلے کو مدینہ منورہ پر جنوب مشرقی گوشے سے حملہ کرنے پہ آمادہ کریں۔

ــــ چونکہ اس قبیلے سے مسلمانوں کا باقاعدہ حلیفانہ معاہدہ ہو گیا تھا کہ مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مدافعت کریں گے۔ لہٰذا اس طرف سے بے فکر ہو کر مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ اس سمت میں دفاع کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا بلکہ اپنے بال بچے بھی ان گڑھیوں میں بھجوا دیئے تھے جو بنو قریظہ کی جانب تھیں ــــ کفار نے اسلامی دفاع کے اس کمزور پہلو کو بھانپ لیا۔ اور انہوں نے بنو نضیر کے سرداروں کی سفارت بھیج کر ان کو غداری پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ پہلے پہلے تو وہ ڈرے کہ ہمارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معاہدہ ہے اور ہم کو آن سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ ابتداء میں ان کا موقف یہی تھا۔ لیکن اس کے بعد ابن اخطب نے ان کو مزید دلائل دیئے کہ "دیکھو میں عرب کی متحدہ قوت کو محمدؐ پر چڑھا لایا ہوں، اسلام کو ختم کرنے کا یہ آخری موقع ہے۔ اتنے بڑے لشکر آئندہ کبھی جمع نہیں ہوسکیں گے اور پھر ساری عمر ہم سب کو کف افسوس ملنا پڑے گا۔ چونکہ پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مقابلہ کوئی بھی نہیں کر سکے گا" ابن اخطب کی ان باتوں سے بنو قریظہ پر بھی معاہدے کی پاسداری اور اخلاقی لحاظ پر اسلام دشمنی غالب آگئی۔ اور وہ نقضِ عہد پر آمادہ ہوگئے۔ نبی اکرمؐ اس صورت حال سے بے خبر نہیں تھے۔ آپؐ کو پل پل کی اطلاعات مل رہی تھیں۔ آپؐ نے انصار کے سرداروں میں سے حضرت سعدؓ ابن عبادہؓ اور سعدؓ ابن معاذ نیز دو اور حضرات کو بنو قریظہ کے پاس بھیجا کہ جاکے تحقیق کر کے آؤ کہ صورتحال کیا ہے! ادھر خود اہل ایمان کے لشکر میں منافقین کا فتنہ کالم کا عنصر موجود تھا۔ وہ مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کے لئے خبریں پھیلا رہے تھے کہ اب بنو قریظہ کی جانب سے بھی حملہ ہوا چاہتا ہے۔ لہٰذا ہوش کے ناخن لو اور اپنے گھروں کی خبر لو جو جنوب مشرقی گوشے سے بنو قریظہ کی براہ راست زد میں ہیں اور یہ منافقین پٹی پڑھا رہے تھے کہ یٰٓاَھْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَکُمْ فَارْجِعُوْا " اے یثرب کے لوگو! تمہارے لئے اب ٹھیرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، پس پلٹ چلو" جیسا کہ ہم پچھلے رکوع میں پڑھ چکے ہیں ــــ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن سرداروں کو بنی قریظہ سے گفت وشنید کے لئے بھیجا تھا تو ان کو تاکید فرمائی تھی کہ اگر تم دیکھو کہ بنو قریظہ اپنے عہد پر قائم ہیں تو تم آکر سارے لشکر کے سامنے علی الاعلان خوش خبری دینا کہ یہ محض افواہ ہے، اس کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ نقضِ عہد کا فیصلہ کر چکے ہیں تو صرف مجھے اشارۃً اس کی اطلاع دینا۔ عام لوگوں کے سامنے بیان نہ کرنا کیونکہ ہوسکتا ہے کہ بعض

لوگوں کے حوصلے مزید پست ہو جائیں۔ ان حضرات نے واپس آکر حضورؐ کو اشارہ دکنا۔ یں بنو قریظہ کے عزائم سے آگاہ کر دیا۔ اس لئے کہ بنو قریظہ کے سرداروں نے ان انصار سے برملا کہہ دیا تھا کہ لا عقد بیننا وبین محمد ولا عھد "ہمارے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مابین کوئی عہد و پیمان نہیں ہے" خلاص ۔۔۔۔

غزوہ احزاب میں سب سے زیادہ تشویشناک صورت بنی تھی تو وہ بنو قریظہ کی اس غداری سے بنی تھی، اس لئے کہ نہ صرف اسلامی لشکر کا عقب محفوظ نہیں رہا تھا اور بلکہ وہ گڑھیاں اور مدینہ منورہ کا شہر بھی محفوظ نہیں رہے تھے جہاں صرف عورتیں اور بچے تھے۔ وہ تو اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک صاحب نعیم ابن سعودؓ قبیلہ غطفان کی شاخ اشجع مسلمان ہو کر حضور کی خدمت میں خفیہ طور پر حاضر ہوئے۔ انہوں نے عرض کیا کہ میرے اسلام قبول کرنے کا ابھی کسی کو علم نہیں ہے۔ آپؐ اس وقت جو چاہیں مجھ سے خدمت لے سکتے ہیں حضورؐ نے فرمایا کہ اگر ممکن ہو تو تم جا کر ان احزاب اور بنو قریظہ میں پھوٹ ڈالنے اور عدم اعتماد پیدا کرنے کی کوئی تدبیر کرو۔ چنانچہ انہوں نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ وہ پہلے بنو قریظہ کے پاس گئے جہاں ان کا پہلے ہی سے آنا جانا تھا اور وہ وہاں متعارف تھے اور ان کے سرداروں سے کہا کہ "قریش اور غطفان کے قبائل تو محاصرے کی طوالت سے تنگ آکر بغیر لڑے بھڑے واپس بھی جا سکتے ہیں۔ ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ لیکن تم کو یہیں رہنا ہے ایسی صورت میں تمہارا کیا حشر ہوگا! اس کو بھی سوچ لو۔ میری رائے ہے کہ تم اس وقت تک کوئی اقدام نہ کرنا جب تک باہر سے آئے ہوئے ان قبائل کے چند سربرآوردہ لوگ تمہارے پاس بطور یرغمال نہ ہوں"۔ بنو قریظہ کے دل میں یہ بات اتر گئی اور انہوں نے متحدہ محاذ کے قبائل سے یہ مطالبہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر یہ صاحب قریش اور غطفان کے سرداروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ "میں بنو قریظہ کے پاس سے آرہا ہوں۔ وہ کچھ متذبذب معلوم ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تم سے یرغمال کے طور پر چند آدمی طلب کریں اور پھر انہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حوالے کر کے اُن کے ساتھ از سر نو اپنا معاملہ استوار کر لیں۔ اس لئے ان کے ساتھ ہوشیاری سے نمٹنے کی ضرورت ہے"۔ یہ سردارانِ لشکر اس بات سے کھٹک گئے۔ انہوں نے بنو قریظہ کو کہلا بھیجا کہ ہم اس طویل محاصرے سے تنگ آگئے ہیں، اب ایک فیصلہ کن معرکہ ہونا ضروری ہے۔ کل تم اپنی سمت سے بھرپور حملہ کرو۔ ادھر سے ہم

یکبارگی مسلمانوں پر یلغار کر دیں گے۔ بنو قریظہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ جب تک آپ اپنے چند چیدہ آدمی بطور یرغمال ہمارے حوالے نہیں کریں گے ہم جنگ کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ انہوں نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس طرح دونوں فریق اپنی اپنی جگہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ نعیم کی بات سچی تھی۔ نتیجۃً نعیم ابن سعودؓ کی یہ حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی اور دشمنوں کے کیمپ میں بداعتمادی اور پھوٹ پڑ گئی ـــــ اور بنو قریظہ نے عملاً اس غزوے میں کوئی حصہ نہیں لیا ـــــ لیکن معاہدہ وہ فسخ کر چکے تھے اور انہوں نے برملا کہہ دیا تھا کہ " لاعقد بیننا و بین محمّد ولا عھد" لہٰذا اب جب کہ غزوۂ احزاب اس معنی میں ختم ہوا کہ مشرکین عرب کے تمام لشکر محاذ چھوڑ کر اپنے اپنے مستقر کی طرف لوٹ گئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہتھیار اتار رہے تھے کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام تشریف لائے اور انہوں نے فرمایا کہ ' اے اللہ کے رسولؐ ! آپؐ ہتھیار اتار رہے ہیں اور ہم نے ابھی ہتھیار نہیں اتارے ہیں۔ لہٰذا آپ فوراً تشریف لے جا کر بنو قریظہ کا محاصرہ فرمائیے " چنانچہ اسی وقت حضورؐ نے حکم دیا کہ کوئی مسلمان عصر کی نماز بنو قریظہ کی بستی میں پہنچنے سے قبل نہ پڑھے۔

اب یہاں ایک اہم بات بھی لگے ہاتھوں بیان کر دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہمارے ہاں جو دو مکاتیب فکر ہیں یعنی اصحاب الرائے اور اصحاب الحدیث ـــــ ان کے مابین اصل اختلاف کیا ہے! وہ آج واضح ہو جائے گا کہ وہ اصلاً ہے کیا اس بات کو پلّے باندھ لیجئے۔ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ کوئی مسلمان عصر کی نماز نہ پڑھے جب تک بنی قریظہ پر نہ پہنچ جائے۔ معنی کیا تھے۔ یہ کہ جلد سے جلد پہنچو۔ اللہ کا حکم ہے۔ حضرت جبریلؑ نے آکر بتایا ہے۔ جلد پہنچنے کے لئے حضورؐ نے فرمایا کہ عصر سے پہلے پہلے پہنچ جاؤ۔ تاکہ ان کا معاملہ چکا دیا جائے۔ اب راستے میں صورت یہ پیش آگئی کہ ایک ٹکڑی ابھی بنو قریظہ تک نہ پہنچ پائی تھی کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ لشکر مختلف ٹکڑیوں میں منزل کی جانب بڑھ رہا تھا کئی میل کا سفر تھا۔ جس ٹکڑی کو راستہ ہی میں عصر کی نماز کا وقت آگیا تو نماز قضا ہونے کا امکان پیدا ہو گیا۔ اب ان لوگوں کے مابین اختلاف پیدا ہوا۔ ایک فریق نے یہ کہا کہ حضورؐ کا منشا یہ نہیں تھا کہ وہاں پہنچے بغیر عصر مت پڑھو۔ بلکہ منشا یہ تھا کہ ہم عصر سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔ اب اگر کسی وجہ اور مجبوری سے درمیان ہی میں عصر کا وقت ہو گیا تو

ہمیں نماز پڑھ لینی چاہیئے ـــــ ایک فریق نے کہا کہ نہیں جو حضورؐ نے فرمایا ہے ہم تو اسی کے مطابق عمل کریں گے۔ ہم نہیں جانتے کہ منشأ کیا تھا اور کیا نہیں" منشأ تو حضورؐ ہی کو معلوم ہوگا! اگر کوئی منشأ معین کرے گا تو صدقِ صدیقین سے تو نہیں کہہ سکتا کہ واقعی حضورؐ کا منشأ یہی تھا ـــــ اس مسئلہ میں تو اس کی اپنی رائے اور اجتہاد ہوگا۔ وہ اس کا اپنا استنباط ہوگا کہ وہ اس سے یہ نتیجہ نکال رہا ہے۔ لہٰذا ایک فریق نے کہا کہ حضورؐ نے تو 'منشأ' بیان نہیں فرمایا۔ لہٰذا ہم تو الفاظ کی پیروی کریں گے اور عصر کی نماز بنو قریظہ کی بستی تک پہنچنے سے قبل نہیں پڑھیں گے' چاہے نماز قضا ہو جائے' چونکہ فرمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے ـــــ دونوں فریقوں نے اپنی اپنی رائے کے مطابق عمل کر لیا۔ جب حضورؐ کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو حضورؐ نے فرمایا کہ دونوں نے صحیح عمل کیا! اب یہ ہے وہ حکمت جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تعلیم فرما گئے ہیں۔ اللہ کے لئے بات کو کھلے دل سے سمجھئے اور خواہ مخواہ رائے' تعبیر اور اجتہاد کے اختلاف پر مستقل طور پر من دیگرم تو دیگری کا رویّہ اختیار نہ کیجئے۔ یہ تفرقہ وحدتِ امت کیلئے سمِ قاتل ہے۔ ایک رویّہ یہ ہے کہ حدیث کے جو الفاظ (Letters) ہیں' ہم تو بالکل حرف بہ حرف' ہو بہو 'Literally' اس پر عمل کریں گے۔ ہم نہیں جانتے کہ علت کیا ہے اور حکمت کیا ہے! وہ اللہ جانے اور اس کا رسولؐ جانے۔ اگر مسواک کا لفظ حدیث میں آیا ہے تو ہم تو مسواک ہی استعمال کریں گے ـــــ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ مسواک کرنے کی اصل غایت و علت دانت صاف رکھنا ہے۔ اگر ٹوتھ پیسٹ اور برش سے دانت صاف کر لئے تو مقصد پورا ہو گیا ـــــ اس طرح یہ دو مکاتیبِ فکر ہیں۔ ایک اصحابِ حدیث جو حدیث کے الفاظ کو جوں کا توں اختیار کرنے کو صحیح اور اقرب الی السنۃ سمجھتے ہیں۔ اور اسی طرزِ عمل میں عافیت خیال کرتے ہیں۔ دوسرے اصحاب الرّائے ہیں جو غور و تدبّر کرتے ہیں کہ کسی حدیث کی اصل حکمت کیا ہے! اس کی غرض و غایت کیا ہے اس کو اختیار کرنا بہتر ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی تصویب فرمائی ـــــ اللہ کا شکر ہے اور اس کا کرم و فضل ہے کہ اس معاملے میں اس نے اپنے رسولؐ سے دونوں طرزِ عمل کی تائید کرا دی۔ چونکہ دونوں کی نیت دراصل تعمیل حکم اور اتباع تھا پس ہم کو بھی یہی رویّہ اختیار کرنا چاہیئے کہ دونوں کے لئے اپنے دل میں کشادگی پیدا کریں

عمل تو ایک ہی پر ہوگا، اس میں تو کوئی شک نہیں۔ یا آپ الفاظِ ظاہریہ پر عمل کریں گے یا اس کی حکمت و علت معلوم کرکے اسے اختیار کریں گے ــــــ اجتہاد کی بنیاد بھی تو یہی ہے کہ اہلِ علم احکامِ شرعیہ کی علت تلاش کریں اور دیکھیں کہ درپیش مسئلہ میں علت کس درجہ کی مشترک ہے۔ اسی کے مطابق قیاس کرکے مسئلہ کا حل نکال لیا جائے۔ ــــــ تو یہ طریقہ تھا اصحابِ فقہ کا، جن کو اصحاب الرائے بھی کہا گیا ہے اور اوّل الذکر طریقہ تھا اصحابِ حدیث کا ــــــ لیکن حقیقت نفس الامری اس واقعہ سے ہمارے سامنے یہ آتی ہے کہ دونوں مسلک حق ہیں۔ چونکہ نبی اکرمؐ نے اس واقعہ میں دونوں فریقوں کی تصویب فرمائی ــــــ چونکہ یہ واقعہ اسی غزوہ کے دوران پیش آیا تھا تو میں نے چاہا کہ اسے بھی آپ حضرات کے سامنے رکھ دوں۔ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے ہر واقعہ میں ہمارے لئے رہنمائی ہے اور یہی حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے اکمل و اتم ہونے کی دلیل ہے ــــــ بہرحال یہ ایک ضمنی بحث تھی جو درمیان میں آگئی۔ اب اصل موضوع کی طرف رجوع کیجئے۔

بنو قریظہ کی گڑھیوں پر سب سے پہلے وہاں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں ایک لشکر بطور مقدمۃ الجیش پہنچا۔ بنو قریظہ یہ سمجھے کہ یہ ہمیں محض دھمکانے آئے ہیں۔ وہ اس وقت تک تو بڑے طنطنے میں تھے۔ انہوں نے اپنے کوٹھوں پر چڑھ کر نبی اکرمؐ اور مسلمانوں کی شان میں گستاخیوں کی بوچھاڑ کردی۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں پورے اسلامی لشکر نے وہاں پہنچ کر ان کی بستی کا محاصرہ کرلیا تو ان کے ہوش ٹھکانے آئے۔ انہوں نے عین آڑے اور پُرخطر وقت معاہدہ توڑ ڈالا تھا۔ اور مدینہ کی پوری آبادی کو ہلاکت خیز خطرے میں مبتلا کردیا تھا۔ انہوں نے پشت سے خنجر گھونپنے کی پوری تیاری کرلی تھی۔ یہ تو حضرت نعیم کی جنگی چال اور حکمت عملی تھی، جس سے وہ مات کھا گئے۔ ان کا جرم کسی طور پر بھی قابلِ عفو نہیں تھا ــــــ اور ان کو قرار واقعی سزا ملنی چاہیئے تھی۔

جب محاصرے کی شدت جو دو تین ہفتے جاری رہی، ان کے لئے ناقابل برداشت ہوگئی تو انہوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈالنے اور خود کو نبی اکرمؐ کے حوالے کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ قبیلۂ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حَکَم بنایا جائے، وہ ان کے متعلق جو بھی فیصلہ کریں وہ فریقین تسلیم کرلیں۔ انہوں نے حضرت سعدؓ کو اس توقع پر حَکَم بنانے کی تجویز رکھی

تھی کہ اوس اور بنو قریظہ کے مابین مدتوں سے حلیفانہ تعلقات چلے آرہے تھے۔ ان کو امید تھی کہ وہؓ ان کا لحاظ کریں گے اور قینقاع اور بنو نضیر کی طرح ان کو بھی اپنے سازو سامان کے ساتھ مدینہ منورہ سے نکل جانے کا فیصلہ کریں گے۔ حضرت سعدؓ کو خندق میں دشمنوں کا ایک تیر لگ گیا تھا اور وہ شدید زخمی تھے۔ نبی اکرمؐ نے ان کے علاج ومعالجہ کے لئے مسجد نبوی میں ایک خیمہ لگوا رکھا تھا۔ حضورؐ خود ان کی تیمار داری فرمارہے تھے۔ آپؐ نے خود اپنے ہاتھ سے ان کے زخم کو داغا تھا۔ حضورؐ کو حضرت سعدؓ سے بہت محبت تھی۔ انصار میں دو سعد تھے۔ ایک سعدؓ ابن معاذ جو رئیس قبیلۂ اوس تھے اور دوسرے سعدؓ ابن عبادہ جو رئیس قبیلۂ خزرج تھے۔ ویسے نفری اور حیثیت کے اعتبار سے اوس کا قبیلہ، خزرج کے قبیلے سے بہت کم تھا۔ غالباً ایک اور تین کی نسبت تھی۔ چنانچہ ایام جاہلیت میں معاہدہ طے تھا کہ اگر کسی اوسی کے ہاتھوں کوئی خزرجی قتل ہو جائے گا تو تین اوسی قصاص میں قتل کئے جائیں گے ــــ ہوسکتا ہے کہ دو کی تعداد مقرر ہو، اس بارے میں مجھ سے اس وقت غلطی ہو سکتی ہے۔ لیکن بات اپنی جگہ درست ہے۔ خود حضرت سعدؓ ابن معاذ کو بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی محبت تھی۔ ان کی بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرح فدویت کی کیفیت تھی ــــ حضرت سعدؓ بن معاذ ایک ڈولی میں بنو قریظہ کی بستی میں لائے گئے۔ حضرت سعدؓ نے جو فیصلہ کیا وہ عین یہود کی شریعت کے مطابق تھا وہ یہ کہ بنو قریظہ کے تمام مرد قتل کر دیئے جائیں۔ عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے اور ان کے تمام املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ اس فیصلے میں یہ مصلحت بھی ہوگی کہ حضرت سعدؓ اس غزوہ میں دیکھ چکے تھے کہ بنو قینقاع اور بنو نضیر کو مدینہ سے نکل جانے دیا گیا تو وہ گرد وپیش کے سارے قبائل کو بھڑکا کر قریش کی سرکردگی میں تقریباً بارہ ہزار کا لشکر لے کر مدینہ پر چڑھ دوڑے تھے۔ چنانچہ حیاتِ طیبہ کے دوران اجتماعی قتل اور سخت ترین سزا کا یہی ایک واقعہ ہوا ہے جو بنو قریظہ کے ساتھ ہوا۔ اگر یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تسلیم کر لیتے جو انتہائی رؤف اور رحیم تھے تو وہ شاید اس انجامِ بد سے بچ جاتے۔ لیکن مشیتِ الٰہی یہی تھی اس لئے ان کی مت ماری گئی ۔ اور انہوں نے حضورؐ پر عدم اعتماد کیا ــــ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، حضرت سعدؓ ابن معاذ نے یہ فیصلہ عین تورات کے مطابق کیا تھا۔ بنو قریظہ اسی انجام کے مستوجب تھے چونکہ انہوں نے اس وقت جبکہ مسلمانوں کے لئے انتہائی کٹھن وقت تھا، عقب سے مسلمانوں کی پیٹھ میں خنجر

گھونپنے کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ جب مسلمان بنو قریظہ کی گڑھیوں میں داخل ہوئے تو ان کو پتہ چلا کہ جنگ احزاب میں حصہ لینے کے لئے ان غداروں نے ۱۵ سو تلواریں، تین سو زرہیں دو ہزار نیزے اور ۱۵ سو ڈھالیں جمع کر رکھی تھیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی تائید شاملِ حال نہ ہوتی تو ایک طرف مشرکین یکبارگی خندق عبور کر کے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے اور دوسری طرف یہ سارا جنگی سامان عین عقب سے مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے بنو قریظہ استعمال کرتے۔

زیرِ درس رکوع کی بقیہ دو آیات کا تعلق اسی بنو قریظہ کے واقعہ سے ہے اس لئے میں نے قدرے تفصیل سے صورت حال واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو ان آیات کے پس منظر سے براہِ راست متعلق ہے۔ اب ان آیات کا مطالعہ کیجئے۔ فرمایا:

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ

"اور اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا یعنی بنو قریظہ تو اللہ ان کی گڑھیوں سے انہیں اتار لایا!"

یہ پہلے تو محاصرے کی حالت میں اپنے قلعوں پر چڑھے رہے لیکن دو تین ہفتوں سے زیادہ سہار نہ سکے اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کے قلعوں سے نیچے اتار لایا ـــــ یہاں 'ظَاهَرُوْهُمْ' کا لفظ قابل توجہ ہے۔ اس لفظ کی اصل ظَهْرٌ ہے۔ بابِ مفاعلہ میں اس سے مظاہرہ بنتا ہے۔ ظَهْرٌ پیٹھ کو کہتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں آخری مقابلہ پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر ہوتا تھا۔ کوئی چھوٹی سی نفری کسی بڑی نفری کے گھیرے میں آجاتی تھی تو چھوٹی نفری والے پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر لڑا کرتے تھے۔ اس طرح اس کا مفہوم ہوگا کسی مقصد کے غلبہ کے لئے یک جان ہو کر کام کرنا ـــــ اس لئے میں نے اس آیت کی ترجمانی میں 'حملہ آوروں کا ساتھ دینا' کیا ہے ـــــ صَيَاصِىْ کی لغوی بحث کو بھی سمجھ لیجئے مرغ کے پنجے کو صیص کہتے ہیں، اسی کی جمع صیاصی ہے۔ پس چونکہ مرغ اپنے پنجوں سے دفاع کرتا ہے، لہٰذا عرب اس کو استعارتاً دفاعی قلعوں اور گڑھیوں کے لئے استعمال کرنے لگے ـــــ بنو قریظہ نہ تو حملہ آوروں کا ساتھ دے سکے اور نہ ان کے قلعے ان کو پناہ دے سکے۔ اور وہ ان سے نیچے اترنے اور باہر نکل کر خود کو نبی اکرمؐ کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے ـــــ اسی آیت میں آگے فرمایا:

وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ

"اور اللہ نے ان کے دلوں میں

رُعب ڈال دیا:

آپ غور کیجئے کہ اگر وہ بدو لڑنے کا فیصلہ کرتے تو ان کے جو دو سو مرد قتل ہوئے تھے تو یہ پچاس ساٹھ مسلمانوں کو بھی شہید کر سکتے تھے ___ انہوں نے جو ساز و سامان جمع کر رکھا تھا اس کی تفصیل میں بیان کر چکا ہوں ___ لیکن اسلحہ استعمال کرنے کے لئے ہمت اور جوش و ولولہ درکار ہوتا ہے۔ جب کسی قوم کو وَھَن کی بیماری لگ جاتی ہے۔ یعنی حُبِّ دنیا اور موت کا خوف تو یہ حال بھی ہوتا ہے کہ میزائل تک دھرے رہ جاتے ہیں اور فوج کو ان کے بٹن دبانے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اس کے بجائے جان بچانے کے لئے اپنی جوتیاں چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے ___ ہمارے ساتھ یہ ہوا ہے۔ صحرائے سینا سے مصری فوج اسرائیل کے حملے کے وقت بھاگ گئی تھی۔ اسی طرح فتنہ تاتار کے دور میں ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا ہے تو تاریخ بتاتی ہے کہ بغداد کے بازاروں میں سو مسلمان کھڑے ہوتے تھے اور ایک تاتاری آتا تھا اور ان سے کہتا تھا کہ میرے پاس اس وقت تلوار نہیں ہے۔ میں اس کو لے کر آتا ہوں۔ خبردار کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ اور وہ تلوار لے کر آتا تھا اور ایک ایک کی گردن مارتا تھا اور کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے۔ بنو قریظہ میں جرأت و ہمت ہوتی تو حضرت سعدؓ کے فیصلے کے بعد بھی یہ کر سکتے تھے کہ یک بارگی مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں کہ ہمیں تو مرنا ہی ہے، بیس پچیس کو ساتھ لے کر مریں گے۔ لیکن نہیں چونکہ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ۔ اللہ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈالا کہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو گئے ___ آگے فرمایا:

فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۝	"اے مسلمانو! ان کے ایک فریق کو تم قتل کر رہے اور ایک فریق کو اسیر بنا رہے ہو"

ان کے مرد قتل کئے گئے اور ان کی عورتیں، بچے اور بچیاں غلام اور لونڈیاں بنائی گئیں۔ اس پوری صورت حال پر صرف ایک آیت میں تبصرہ فرما دیا گیا۔

آگے اس رکوع کی آخری آیت میں فرمایا:

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ط وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرًا ۝	"اور اللہ نے تمہیں ان کی زمین، اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور ▪ علاقہ تمہیں دے دیا جسے

تم نے پامال نہیں کیا تھا اور اللہ ہر چیز پہ قادر ہے۔"

آخر یہودی قبیلہ تھا۔ بہت مالدار اور سرمایہ دار ــــ ان کے بڑے بڑے باغات تھے۔ بڑی بڑی حویلیاں تھیں۔ بے شمار مال و متاع تھا ــ یہ پورا علاقہ تمہیں بغیر لڑے بھڑے عطا کر دیا۔ جنگ تو ہوئی ہی نہیں۔ صرف محاصرے کے نتیجے میں یہ سب کچھ ہاتھ آ گیا۔ اس زمین پر گھوڑے دوڑے ہی نہیں کہ وہ پامال ہوتی ــــ

اس رکوع کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ مبارکہ پر وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ہ اس رکوع کا اس سے جامع اختتام نہیں ہو سکتا تھا۔ غزوۂ احزاب کی پوری صورت واقعہ بنو قریظہ کا خاتمہ، یہ تمام امور اللہ تعالیٰ کی مطلق قدرت کی شان کے مظاہر ہی تو تھے۔ سورۃ یوسف میں فرمایا:

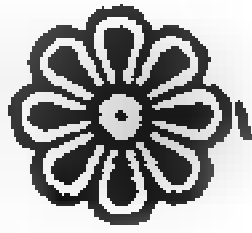
وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ہ "اور اللہ غالب ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"

اگر لوگوں کو یہ یقین قلبی ہو جائے تو اسی سے مانگیں، اسی سے جڑیں، اسی کے دامن سے وابستہ ہو جائیں۔ انہیں تو ان وسائل اور اسباب پر یقین و توکل ہوتا ہے جو ان کی دسترس میں ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الزهادة فی الدنیا لیست بتحریم الحلال ولا اضاعة المال "دنیا میں زہد اس چیز کا نام نہیں ہے کہ تم حلال کو اپنے اوپر حرام کر لو اور مال کو ضائع کرو"ــ یہ زہد نہیں ہے۔" ولکن الزهادة فی الدنیا الا تکون بما فی یدیک اوثق بما فی یدی اللہ - اصل زہد یہ ہے کہ اللہ پر تمہارا اعتماد و توکل اس سے زیادہ ہو جو تمہارے ہاتھ میں ہے "ــــ میرے وسائل، میرے ذرائع، میری صلاحیتیں، میری ذہانت، میری قوت میرا یہ اور میرا وہ۔ اس کو مقدم رکھو گے اور اس پہ زیادہ تکیہ کرو گے تو تم کو زہد چھو کر بھی نہیں گیا۔ لیکن اگر تم کو اللہ کی توفیق، اللہ کی تائید، اللہ کی نصرت اور اللہ کی قدرت پر ہی تمہارا اعتماد و توکل اور بھروسہ ہو جائے تو یہ اصل زہد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ ہم نے آج اس رکوع کا مطالعہ ختم کر لیا۔ جیسا کہ میں نے ابتدا ہی میں عرض کیا تھا کہ آج ہم اس رکوع کے مطالعہ کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ کی روشنی میں آپؐ کے اس "اسوۂ حسنہ" کو مجموعی طور پر سمجھنے کی کوشش کریں گے جو غزوہ احزاب کے اس پس منظر میں اس رکوع میں بیان ہوا ہے۔

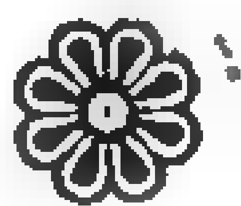
پورے قرآنِ مجید میں آپؐ کے "اسوۂ حسنہ" کا تذکرہ اسی ایک مقام پر کیا گیا ہے ــــ میں عرض کر چکا ہوں کہ شخصی طور پر تو نبی اکرمؐ پر خود آپؐ کے ارشاد کے مطابق سب سے سخت دن "یوم طائف" گزرا ہے لیکن بحیثیت مجموعی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جماعت پر سب سے زیادہ ابتلاء و آزمائش اور گھٹن کا مرحلہ یہ غزوہ احزاب ہے، جس میں جانی نقصان تو بہت کم ہوا لیکن اس محاصرے کے دوران جو تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا، صحابہ کرامؓ کی جماعت کو جن شدائد و مصائب و تکالیف سے سابقہ پیش آیا بجا طور پر ان کو ابتلاء کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے۔ اس کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ۝ اس آیت کا ہم تفصیل سے دوسرے رکوع کے درس میں مطالعہ کر چکے ہیں۔ اور آج کے درس میں بھی اس کا حوالہ آیا ہے ــــ آج کا یہ درس ان لوگوں کے لئے انتہائی سبق آموز ہے جو بفضلہ تعالیٰ شعوری طور پر یہ بات جان چکے ہیں کہ اعلائے کلمۃ اللہ، اظہار دین الحق اور اقامت دین، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر اُمتی پر فرض ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنی تقریر میں حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے مختلف پہلو اجاگر کروں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع اور صحابہ کرامؓ کے نقش قدم کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُاللّٰهَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ



ہماری دینی ذمّہ داریاں

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں



سورۂ احزاب کے تیسرے رکوع کے درس کے بعد ایک اضافی خطاب

اَحْمَدُہٗ وَاُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ۔ امابعد

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ‏ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ

الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝ (الاحزاب - آیت ۲۱) صدق اللّٰہ العظیم
رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْ اَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً
مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ

اللہ کا شکر و احسان ہے کہ ہم نے آج سورۃ احزاب کے تیسرے رکوع کا درس و مطالعہ مکمل کر لیا۔ میں نے ابتدا ہی میں عرض کر دیا تھا کہ میں درس کے بعد "اُسوۂ حسنہ" کے موضوع پر مزید گفتگو کروں گا۔ چنانچہ میں اب اللہ کا نام لے کر اس کا آغاز کر رہا ہوں ـــ میں چاہتا ہوں کہ اس 'اُسوۂ حسنہ' کے بارے میں آپ چند اور باتیں سلسلہ وار ایک، دو، تین کی طرح نوٹ کر لیں اور اپنے حافظہ اور ذہن میں بٹھا لیں ـــ میں دورانِ درس یہ عرض کر چکا ہوں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ اور حیاتِ طیبہ ہر ایک اعتبار سے اُسوہ ہے۔ 'اُسوہ' کا اصل مفہوم اتباع اور پیروی ہے۔ لیکن سورۃ الاحزاب کے درس کے دوران آنحضورؐ کا جو اُسوہ ہمارے سامنے آتا ہے، اس کو پیش نظر رکھیے اور پہلے ایک سوال کا جواب آپ خود اپنے طور پر دینے کی کوشش کیجئے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو اجتماعی جدوجہد ہے، وہ کیا ہے! میرا یہ سوال بہت اہم ہے، اس کو نوٹ کیجئے کہ میں نے اجتماعی جدوجہد کو کیوں خاص طور پر QUALIFY کیا ہے؟ ـــ

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض کام خالص انفرادی ہیں۔ اور وہ ایسے بھی ہیں کہ ہم ان کا اتباع نہیں کر سکتے ـــ مثلاً نبی اکرمؐ صومِ وصال رکھتے تھے۔ لیکن ہمیں منع کیا گیا۔ حضورؐ بغیر افطار کے ایک کے بعد دوسرا پھر تیسرا روزہ رکھا کرتے تھے ـــ اس سے بھی زیادہ رکھا ہے۔ لیکن اُمت کو روک دیا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوچھا بھی کہ آپ ہم کو کیوں منع فرماتے ہیں! ـــ جواب میں ارشاد ہوا: اَيُّكُمْ مِثْلِيْ ـــ "تم میں سے کون ہے جو مجھ جیسا ہو!" اَبِيْتُ عِنْدَ رَبِّيْ ـــ "میں اپنے ربّ کے پاس رات بسر کرتا ہوں" ـــ وَهُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ـــ وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے" ـــ معلوم ہوا کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انفرادی زندگی کے بعض پہلو ایسے ہو سکتے ہیں۔ جن کے لئے ہم اتباع کے مکلف نہیں ہیں ـــ وہ خصوصیات ہیں جناب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی۔

حضورؐ فرماتے ہیں کہ میں اپنی پشت کی طرف سے بھی دیکھتا ہوں — ہم کیسے کریں گے! اس اعتبار سے اوّلیت جس اُسوہ کو حاصل ہے، وہ اُسوہ آپ کی اجتماعی زندگی کا نقشہ ہے — اس کا ہر ہر قدم واجب الاتباع ہے — اسی اتباع کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ: اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ — اس لئے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ ذرا اپنے ذہن میں یہ سوال لائیے کہ نبی اکرمؐ کی جو اجتماعی جدوجہد ہے، وہ کس نوعیت کے کام سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے -! مثلاً ایک نوعیت ہوتی ہے رفاہ عامہ کے کاموں کی — لوگ یہ کام کرتے ہیں - پھر خدمتِ خلق کے بے شمار میدان ہیں، جن کے لئے انجمنیں بنتی ہیں، ادارے وجود میں آتے ہیں — دوسرے کچھ ہوتے ہیں محدود پیمانے کے تبلیغی کام — دنیا میں بے شمار مشنریز (MISSIONARIES) ہیں جو تبلیغ کے کام میں مصروف ہیں۔ ہندوؤں کی تبلیغ ہے، عیسائیوں کی تبلیغ ہے - بدھ مت کے بھکشو ہیں جو تبلیغ کرتے ہیں - آریہ سماجی ہیں جو یہ کام کرتے ہیں — یہ بھی ایک اجتماعی نوعیت کا کام ہے یہ وہ تبلیغ ہے جس میں تلوار کبھی ہاتھ میں نظر نہیں آئے گی — اس تبلیغ کا معاملہ کبھی جہاد و قتال تک نہیں جائے گا - وہ ساری عمر تبلیغ ہی رہے گی اور نسلاً بعد نسلٍ یہ سلسلہ چلتا رہے گا — ذہن میں تیسرا خانہ بنایئے تعلیمی اور تحقیقی کام کا — اس کے لئے بھی انجمنیں بنتی ہیں، ادارے بنتے ہیں - تعلیم کو عام کرنے کی عملی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں - مکتب، اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہوتی ہیں - ریسرچ کے لئے ادارے اور فاؤنڈیشن قائم ہوتے ہیں جن کے تحت یہ کام ہوتا ہے - کسی خاص فکر کو پھیلانے اور PROMOTE کرنے کے لئے اکیڈمیاں بنتی ہیں جیسے 'اقبال اکیڈمی' جو ڈاکٹر اقبال مرحوم کے فکر کو پھیلانے کے کام میں مصروف ہے - سقراط نے بھی ایک اکیڈمی بنائی تھی - جس میں وہ اپنے فکر کے مطابق کچھ ذہین لوگوں کو تیار کرتا تھا - چوتھا کام سیاسی نوعیت کا ہوتا ہے - اس کیلئے بھی جماعتیں، جمعیتیں اور پارٹیاں بنتی ہیں تحریکیں اٹھتی ہیں، سیاسی میدان میں کام ہوتا ہے الیکشن ہوتے ہیں — اس سیاسی کام کی اصل نوعیت عموماً کیا ہوتی ہے؟ ذرا اس پر بھی غور کر لیجئے — اس کی اصل نوعیت یہ ہوتی ہے کہ جس جگہ جو نظام

قائم ہوتا ہے اصولی اعتبار سے اُس سے اختلاف نہیں ہوتا - ہوتا صرف یہ ہے کہ تفصیلات میں انتظامی اعتبارات سے ایک جماعت کا منشور (MANIFESTO) کچھ اور ہے اور دوسری جماعت کا کچھ اور ہے - مثلاً امریکہ میں ڈیموکریٹس (DEMOCRATES) اور ری پبلکن (REPUBLICAN) پارٹیاں ہیں اور انگلینڈ میں لیبر پارٹی، کنزرویٹو پارٹی اور لبرل پارٹی ہے - تو امریکہ یا انگلستان میں جو بنیادی دستور اور نظام رائج ہے یعنی جمہوریت کا نظام تو وہ سب پارٹیوں کے نزدیک متفق علیہ ہوتا ہے - لیکن تفصیلات میں جا کر چند پالیسیوں کے بارے میں اختلافات ہوتے ہیں اور اس ضمن میں پارٹیوں کے منشور (MANIFESTO) میں اختلافات ہوتے ہیں - ہر پارٹی اس اعلان کے ساتھ الیکشن کے میدان میں اُترتی ہے کہ ہمیں ووٹ زیادہ ملیں گے اور اقتدار ہمارے ہاتھ میں آجائے گا تو ہم یہ اور یہ کام کریں گے جس سے ملک اور عوام کو فائدہ پہنچے گا - الی آخرہٖ - یہ ہوتی ہے سیاسی کام کی حقیقی نوعیت --- ویسے یہ فہرست طویل ہو سکتی ہے لیکن چونکہ میرے پاس وقت کم ہے اس لئے آپ ان چار انواع کے کاموں کو ذہن میں بٹھا کر اب پانچویں نوعیت کے کام پر غور کیجئے اور وہ ہے انقلابی کام - انقلاب کیا ہوتا ہے کہ کسی جگہ پر جو نظام قائم ہے، اس کو جڑ سے اکھیڑنا ہے، بنیادی تبدیلی لانی ہے اور پورے نقشے کو بدلنا ہے - ؎

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند
تو نمی دانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

یہ انقلابی کام اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ رائج الوقت نظام کو جڑ اور بنیاد سے اکھیڑ کر اس کی جگہ دوسرا نظام نہ لایا جائے - اب ان پانچ انواع کے کاموں کو ذہن میں بٹھا لیجئے - نمبر ایک، رفاہی کام نمبر۲ - تبلیغی کام نمبر۳ - تعلیمی علمی اور تحقیقی کام نمبر۴ - سیاسی کام اور نمبر۵، انقلابی کام - ہر ایک کے اپنے تقاضے اور اپنی CONNOTATIONS ہیں - ہر ایک کا نقشہ جدا بنے گا - ہر ایک کے لوازم جُدا ہوں گے - اب آپ میرے اس سوال کا جواب دیجئے کہ :

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ ان پانچ کاموں میں سے کس سے

مشابہت رکھتا ہے۔

کیا اس میں کوئی شک ہے کہ وہ انقلابی کام ہے — نظام کی تبدیلی اور وہ بھی جزوی نہیں بلکہ پورے نظام کی تبدیلی — وہ صرف تبلیغی کام نہیں تھا۔ صرف علمی کام نہیں تھا۔ صرف سیاسی کام نہیں تھا۔ صرف رفاہی کام نہیں تھا۔ بلکہ اجتماعی پیمانے پر رفاہی کام تو ہمیں نظر ہی نہیں آتے — وہ کام تو نبی اکرمؐ کی زندگی میں اجرائے وحی سے قبل بالکل انفرادی سطح پر خدمتِ خلق اور رفاہی کام اپنے پورے عروج پر نظر آتا ہے — لیکن نبوت و رسالت کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد حضورؐ کی پوری زندگی ایک انقلابی جدوجہد کا نقشہ پیش کرتی ہے — جزوی نہیں بلکہ مکمل انقلابی جدوجہد — گویا کہ ؎

نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے۔

میں نے سیرت النبیؐ کے موضوع پر متعدد تقاریر کی ہیں، جن میں اس انقلابی جدوجہد کے نقشے کو اپنی امکانی حد تک بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے — اس موقع پر میں چاہوں گا کہ اختصار کے ساتھ اس جدوجہد کے اہم خصائص اور اصول و مبادی آپ کے سامنے اس طرح پیش کروں تاکہ آپ ان کو ترتیب اور نمبروار اپنے ذہن نشین کر لیں —

اس انقلابی جدوجہد کے ضمن میں آپ کو سیرت مطہرہ میں جو سب سے اوّل اوّل اور نمایاں چیز نظر آئے گی، وہ یہ ہے کہ یہ ساری جدوجہد خالص انسانی سطح (HUMAN LEVEL) پر کی گئی ہے — کسی بھی انقلاب میں جو مراحل آتے ہیں، وہ سب کے سب انقلاب محمدی میں آتے — گویا اس اعتبار سے اس انقلاب اور دوسرے انقلابات میں کوئی فرق نہیں — اس وضاحت کے ساتھ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ بات اپنے ذہن میں جما لیجئے کہ ہر انقلابی دعوت کو تین مراحل سے لازماً سابقہ پیش آتا ہے :

پہلا مرحلہ ہے "دعوت و تربیت" — خالص دینی اصطلاحات کے اعتبار سے یہ بات اس طرح کہی جائے گی کہ دعوتِ ایمان اور تزکیہ : لوگوں کو اللہ کی آیات سنانا اور قبول کرنے والوں کا تزکیہ کرنا — یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ

اُبِّیَنَا دَیُزَکِّیکُوْ (البقرۃ) — عام دنیوی لحاظ سے اس کی تشریح یوں ہو گی کہ کوئی فکر ہوگا، کوئی نظریہ ہوگا، کوئی فلسفہ ہوگا اور کوئی نقطۂ نظر ہوگا، اس کو پہلے پھیلایا جائے گا۔ جو اس دعوت کو قبول کریں گے تو اس دعوت کے اعتبار سے پھر ان کی تربیت کی جائے گی۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

خام ہے جبتک تو ہے مٹی کا اک انبار تو پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

پختہ ہوئے بغیر کام نہیں چلے گا۔ البتہ تربیت دعوت کے لحاظ سے ہوگی — جو لوگ کمیونزم کے نظریے کو قبول کرلیں گے، اُنکی تربیت کے لئے کوئی اور نظام ہوگا۔ اس میں یہ نہیں ہوگا کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکوٰۃ ادا کرو حج کرو۔ اپنے تمام معاملات کو اللہ اور اس کے رسُول کی تعلیمات و احکام کے تابع رکھو۔ نہ اس میں یہ ہوگا کہ اپنی نظر اور دل کو پاک صاف رکھو۔ کھُلی آزادی ہوگی کہ جس طرح چاہو اپنی تسکین کا سامان کرلو۔ جاؤ عیش کرو۔ شادی کا کیا سوال ہے۔ اس کے بغیر بھی جنسی ضرورت کو کامریڈ مرد اور کامریڈ عورتیں مِل جُل کر پوری کریں ان کی تربیت میں طبقاتی نفرت و عداوت پیدا کی جائے گی۔ مزدور اور سرمایہ دار کا امتیاز اجاگر کر کے ان کو آپس میں لڑانے کی سبیل اور طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ ان کو تخریب کاری کی TRAINING دی جائے گی۔ تربیت کا نظام ہر انقلابی دعوت میں ہوتا ہے لیکن اس کے PREMISES یعنی اس کے صغریٰ کبریٰ اور متعلقات جُدا ہوتے ہیں۔ وہ اُس نقطۂ نظر کے مطابق ہوں گے کہ اصل کام کیا کرنا ہے۔ کون سا انقلاب لانا پیشِ نظر ہے۔ سوشلسٹ انقلاب برپا کرنا ہے تو اس کی تربیت کی نوعیت وہ ہوگی جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ اسلامی انقلاب لانا ہے تو اس کی تربیت کی نوعیت دوسرے انقلاب کی تربیت کے معاملے میں بالکل جُداگانہ نوعیت کی ہوگی۔ اس میں اللہ پر توحید کے التزام اور شرک سے اجتناب کے ساتھ ایمان لانا ہوگا۔ اس میں یوم آخرت پر اس کی کل جزئیات کے ساتھ ایمان لانا ہوگا۔ اس میں رسالت پر — اطاعت و محبت کلی کے ساتھ ایمان لانا ہوگا — بہرحال ان دونوں الفاظ کو ایک جوڑے کی حیثیت سے BRACKET کر لیجئے۔ دعوت اور تربیت۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ دونوں کام

کیے اور بھرپور طریقے پر کیے۔

دوسرا مرحلہ ہے "تنظیم" اور اسی کے ساتھ جڑا ہوا لفظ ہے "ہجرت" ۔آپس میں جڑو اور دوسروں سے کٹو۔ اسی لئے میں نے تنظیم اور ہجرت کو BRACKET کیا ہے۔ اگر کسی سے کٹو گے تو کسی سے جڑو گے بھی۔ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جڑو گے تو ظاہر ہے کہ اپنے گھر والوں سے کٹو گے۔ سیدھی سادھی بات ہے۔ اس میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ یہاں یہ نہیں ہوسکتا کہ دونوں رشتے ساتھ چل سکیں۔ یہاں CREDIT ہوگا تو Debit بھی ہوگا۔ اکاؤنٹ کا یہ جدید نظام اس بات کو واضح کرنے کے لئے بڑی عمدہ مثال ہے۔ یہاں یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی سے کٹنے کو تیار نہیں تو پھر کسی اور سے جڑ بھی نہیں سکتے۔

اب آپ ان دو الفاظ تنظیم اور ہجرت کو اپنے ذہن میں یکجا یعنی BRACKET کر لیجیے۔

تیسرا مرحلہ ہے۔ جہاد اور قتال۔ جہاد کو میں یہاں PASSIVE RESISTANCE کے معنی میں لے رہا ہوں۔ جدوجہد ہے۔ دعوت و تبلیغ ہے۔ مشرکانہ عقائد پر تنقید ہے۔ اس کے ردّ عمل میں مشرکین کی طرف سے جور و ستم ہے، ایذا رسانی ہے۔ تعدّی ہے۔ مصائب ہیں لیکن ابھی ہاتھ نہیں اٹھ رہا۔ حکم ہے کہ ماریں کھاؤ مگر مدافعت میں بھی اپنا ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جائے، برداشت کرو اور جھیلو۔ تمہیں تپتی ہوئی زمین پر اس حال میں لٹا دیا جائے کہ اوپر سے مکّہ جیسے گرم علاقے کا سورج آگ برسا رہا ہو، پھر تمہارے سینے پر پتھر کی سل رکھ دی جائے۔ تمہاری ٹانگوں میں رسّی باندھ کر کھینچا جائے۔ تو بھی جھیلو اور برداشت کرو RETALIATE نہیں کر سکتے۔ میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ ایسے حالات میں اگر آدمی DESPERATE ہو جائے تو ایک آدمی دس کو مار کر مرے گا۔ لیکن نہیں۔ کیا حضرت یاسرؓ کسی کو نہ مار سکتے تھے جب ان کی نگاہوں کے سامنے ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سمیہؓ کے ابوجہل نے

اس طرح برچھی ماری کہ پشت کے پار ہوگئی! پھر وہ خود یعنی حضرت یاسرؓ کس طرح مظلومانہ اور بہیمانہ طور پر شہید ہوگئے۔ لیکن اُف تک نہ کی۔ چونکہ ایمان لانے کی وجہ سے اس خاندان پر تو ظلم و ستم کے پہاڑ بہت پہلے سے توڑے جا رہے تھے اور جب کبھی ایسے واقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوتا تو آپؐ فرماتے: اِصْبِرُوْا یَا آلَ یَاسِرَ فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃُ۔ "اے آلِ یاسرؓ کے گھر والو! صبر کرو تمہارا ٹھکانا جنت ہے"۔ شہادت کی خوشخبری پیشگی دیدی گئی تھی۔ خبابؓ ابن ارث کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا گیا۔ اوپر نگرانی کے لئے آدمی کھڑا ہوا ہے۔ حکم ہے جھیلو۔ پیٹھ کی چربی پگھلتی ہے اور آگ سرد پڑ جاتی ہے۔ پھر خود ذاتِ مقدس پر کیا کچھ ستم روا نہیں رکھا گیا۔ آپؐ کی راہ میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں جس سے آپ کے پاؤں مقدس زخمی ہو جاتے ہیں۔ یہ کام رات کے اندھیرے میں کیا جاتا ہے چونکہ آپ علی الصبح تاروں کی چھاؤں میں نماز کے لئے باہر نکلا کرتے تھے۔ آپؐ کے مکان میں گندگی پھینکنے کو معمول بنا لیا جاتا ہے اور یہ دونوں کام کرنے والے کون ہوتے ہیں!۔ آپؐ کے پڑوسی اور رشتے میں آپ کے سگے چچا اور چچی یعنی ابولہب اور اس کی بیوی ام جمیل ــ چادر گردن میں ڈال کر اُسے اس طرح بل دیا جاتا ہے کہ مقدس آنکھیں اُبل پڑتی ہیں ــ سجدے کی حالت میں رحمۃ للعٰلمین کے مقدس کاندھوں پر اونٹ کی نجاست بھری اوجھری رکھ دی جاتی ہے۔ تمسخر، استہزا، طعن و تشنیع اور فقرے چست کرنا روز کا معمول بن جاتا ہے۔ قلبِ مبارک پر جو بیتی ہوگی وہ بیتی ہوگی، مومنین صادقین کے دلوں پر کیا گزرتا ہوگا کہ ان کے پیارے اور محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کتنے مصائب ڈھائے اور ستم توڑے جا رہے ہیں۔! مگر وہ ہاتھ نہیں اٹھا سکتے چونکہ آپؐ کو حکم تھا کہ جھیلو، برداشت کرو، صبر کرو۔ اور آپؐ کی وساطت سے یہی حکم تمام اہل ایمان کے لئے تھا۔

اس سے اگلا مرحلہ قتال کا ہے۔ جب دعوت منظم ہو جاتی ہے اور تربیت

کو دارالہجرۃ بننے کی سعادت حاصل ہوجاتی ہے اور وہ مدینۃ النبی بن جاتا ہے اور مسلمان بالفعل ہجرت یعنی ترک وطن کر کے وہاں جمع ہو جاتے ہیں تو ایک BASE مہیا ہو جاتی ہے اور ایک چھوٹی سی شہری اسلامی ریاست قائم ہو جاتی ہے اس موقع پر قتال کا مرحلہ آتا ہے چنانچہ سورۃ الحج میں قتال کی اجازت مل جاتی ہے: اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْاؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ "ہاتھ کھول دیئے گئے اب تمہیں بھی اجازت ہے اینٹ کا جواب پتھر سے دو۔ اس لئے کہ تم پر ظلم ہوا ہے اور اللہ تمہارا مددگار اور پشت پناہ ہے" سورۃ النساء میں الفاظ آئے ہیں ۔ کُفُّوْٓا اَیْدِیَكُمْ۔ نقشہ کھینچا گیا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جب ان سے کہا گیا تھا کہ ہاتھ بندھے رکھو تو کہتے تھے کہ حضورؐ ہمیں بھی اجازت ہونی چاہیئے' ہم بھی لڑیں ہم یہ کر دیں گے وہ کر دیں گے ۔ اب جب کہ لڑائی کا حکم آ گیا تو لڑائی بڑی اوکھی معلوم ہوتی ہے۔ تو وہاں یہ الفاظ آتے ہیں کہ : فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ ۔ تو ان میں ایک فریق ایسا بھی ہے کہ جس کا دل ڈول رہا ہے اور وہ انسانوں سے اس طرح ڈر رہا ہے کہ جیسے اللہ سے ڈرنا چاہیئے بلکہ کچھ اس سے بھی بڑھ کر: اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْیَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْیَةً ۚ ج ۔

کسی انقلابی دعوت کے یہ تین مراحل ہوتے ہیں ۔ مرحلے تین ہیں لیکن الفاظ چھ ہیں گویا ہر مرحلے کے دو پہلو ہوتے ہیں — پہلا مرحلہ ہے ، **دعوت و تربیت** ۔ دوسرا مرحلہ ہے ، **تنظیم و ہجرت** اور تیسرا و آخری مرحلہ ہے **جہاد و قتال** ۔ ان مراحل سے گزرے بغیر دنیا میں کبھی کوئی انقلاب نہیں آیا ہے — عیسائی طرز کی تبلیغ ہو سکتی ہے ۔ تبلیغ کا کام آپ بھی کیجئے کرتے چلے جایئے ۔ اس سے اگلا مرحلہ نہیں آئے گا ۔ وہی کام نسلاً بعد نسلٍ ہوتا رہے گا ۔ لیکن محمد رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا کام اگر آپ دیکھیں گے تو وہ نہ رفاہی کام ہے نہ تبلیغی کام — نہ تعلیمی و علمی کام ۔ یہ

سارے کام اس انقلابی کام میں جزو کی حیثیت سے تو شامل ہیں، لیکن کُل کام خالصتاً کسی انقلابی کام کے مشابہ ہے ــــ پھر یہ انقلابی جدوجہد مکمل اور بھرپور انقلابی جدوجہد ہے ـ نیز یہ کہ یہ پوری انقلابی جدوجہد انسانی سطح (HUMAN LEVEL) پر ہوتی ہے ؎

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری　　تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار

تین سال کی قیدِ شعب بنی ہاشم ہے ــــ جس میں ایسا وقت بھی آیا ہے کہ کھانے کو کچھ نہیں تھا ـ گھاٹی کی جھاڑیوں کے پتے سب کے سب کھا لئے گئے تھے اور بھوک اور پیاس کے مارے بنی ہاشم کے بچوں کی زبانیں خشک ہو گئی تھیں، جن کو تر رکھنے کے لئے سوکھے چمڑے اُبال اُبال کر ان کے حلق میں بوندیں ٹپکائی جاتی تھیں ـ بنی ہاشم کا پورا قبیلہ نبی اکرمؐ کے ساتھ ہی اس گھاٹی میں قید کر دیا گیا تھا ــــ اور "رُسوا سرِ بازارے آں شوخ ستمگارے" کا نقشہ دیکھنا ہو تو وہ یوم طائف دیکھ لیجئے کہ جہاں ایک دن میں وہ کچھ بیت گیا جو مکّہ میں دس سال میں نہیں بیتا تھا ــــ طائف کے سرداروں نے دعوت حق اور دعوتِ توحید کو حقارت اور استہزا کے انداز میں ٹھکرا دیا اور آپؐ سے جو کچھ انہوں نے کہا اُس کو سننے کے لئے بھی بڑے جگرے کی ضرورت ہے ـ نقل کفر کفر نہ باشد ـ ایک سردار نے کہا کہ "اللہ کو تم جیسے مفلس و قلاش کے سوا رسُول بنانے کے لئے کوئی اور نہیں ملا اس طرح تو وہ گویا خود کعبے کے غلاف کو چاک کر رہا ہے" ایک سردار نے کہا کہ "میں تم سے بات کرنے کا بھی روادار نہیں اس لئے کہ اگر تم سچے ہو اور واقعتاً رسول ہو تو ہو سکتا ہے کہ میں کہیں توہین کا مرتکب ہو جاؤں اور عذابِ الٰہی کا نوالہ بن جاؤں اور اگر تم جھوٹے ہو تو کسی جھوٹے سے کلام کرنا میری شان کے خلاف ہے"ـ ایسے ہی اور جملے ان سرداروں میں سے ہر ایک نے کہے ــــ پھر صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جب نبی اکرمؐ بظاہر احوال مایوس ہو کر لوٹنے لگے تو کچھ غنڈوں کو اشارہ کر دیا ـ اوباش لوگ آپؐ کے گرد جمع ہو گئے پھر وہ نقشہ جما ہے کہ جس پر آسمان و زمین لرز گئے ہوں تو کوئی تعجب نہیں ـ ان اوباشوں نے محبُوبِ رب العٰلمین سیّد الاوّلین و الآخرین

پر پتھروں کی بارش شروع کردی ۔ تاک تاک کر ٹخنے کی ہڈیوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے ۔ نالیاں بہتی جارہی ہیں ۔ حضورؐ کا جسدِ اطہر لہولہان ہوگیا ہے نعلین شریف خون سے بھر گئی ہیں اور پیر جم گئے ہیں ۔ ایک موقع پر آپؐ ضعف کے مارے ذرا بیٹھ گئے ہیں تو دو غنڈے آگے بڑھتے ہیں اور بغلوں میں ہاتھ ڈال کر پھر کھڑا کر دیتے ہیں کہ چلو ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ذاتی اعتبار سے ابتلا اور امتحان کا یہ نقطۂ عروج (CLIMAX) ہے ۔ شہر سے باہر آکر آپؐ ایک پتھر سے ٹیک لگا کر تشریف رکھتے ہیں اور اس موقع پر وہ دعا آپ کی زبانِ مبارک سے نکلتی ہی ہے کہ جس کو پڑھتے، سنتے اور سناتے وقت کلیجہ شق ہوتا ہے :-

اَللّٰهُمَّ إِلَيْكَ أَشْكُوْا ضُعْفَ قُوَّتِيْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ وَ هَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ ۔

"اے اللہ! کہاں جاؤں، کہاں فریاد کروں ، تیری ہی جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں ۔ اپنی قوت کی کمی اور اپنے وسائل و ذرائع کی کمی کی ۔ اور لوگوں میں جو رسوائی ہو رہی ہے، اس کی"

إِلٰى مَنْ تَكِلُنِيْ ؟ إِلٰى بَعِيْدٍ يَتَجَهَّمُنِيْ أَوْ إِلٰى عَدُوٍّ مَلَّكْتَهُ أَمْرِيْ؟

"اے اللہ! تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے ؟ کیا تو نے میرا معاملہ دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ جو چاہیں میرے ساتھ کر گزریں ۔ ؟"

إِنْ لَمْ يَكُنْ عَلَيَّ غَضَبُكَ فَلَا أُبَالِيْ ۔

"پروردگار! اگر تیری رضا یہی ہے اور اگر تو ناراض نہیں ہے تو پھر میں بھی راضی ہوں ، مجھے اس تشدد کی کوئی پرواہ نہیں ہے ۔"

؎ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے ۔!

أَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ أَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمٰتُ

"اے ربّ! میں تیرے روئے انور کی ضیاء کی پناہ میں آتا ہوں جس سے ظلمات بھی منور ہو جاتے ہیں ۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یومِ اُحد کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

سے دریافت کیا تھا کہ "یا رسولؐ اللہ! کیا اس سے زیادہ سخت دن بھی آپؐ کی زندگی میں آیا ہے؟" اور آپؐ نے جواب میں فرمایا تھا " نعم ۔ ہاں یوم طائف میری زندگی کا سب سے زیادہ سخت دن تھا"۔ یہ تمام مصائب و مشکلات کے ادوار نبی اکرمؐ پر آئے اور صحابہ کرامؓ پر بھی ۔ اس میں ایک نکتے کی بات ہے، اس پر غور کیجئے وہ یہ کہ ہمارا صغریٰ کبریٰ یہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سید وُلد آدم اور محبوب رب العٰلمین ہیں ۔ جو اس بات میں شک کرے کافر ۔ پھر یہ کہ اللہ علٰی کل شیئٍ قدیر ہے ۔ جو شک کرے وہ کافر ۔ ان دونوں کو جوڑیئے ۔ کیا اللہ اس امر پر قادر نہ تھا کہ انقلاب بھی آ جاتا اور محمدؐ کے پاؤں میں کانٹا بھی نہ چبھتا ۔ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ یہ ہو سکتا تھا، لیکن ہوا نہیں ۔ کیوں نہیں ہوا؟ سوچئے کیوں نہیں ہوا؟ خدا کیلئے مجھے اس کا جواب دیجئے کہ ایسا کیوں نہیں ہوا ۔ ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو مجھ پر اور آپ پر حجّت قائم نہ ہوتی ۔

انقلاب صرف عرب میں لانا مقصود نہیں تھا ۔ اسے پوری دنیا میں لانا تھا اور وہ انسانوں کے ہاتھوں آنا تھا ۔ معجزے تو رسولوں کے لئے ہیں ۔ عام انسانوں کے لئے تو نہیں ہیں ۔ آگے جو کام کرنا تھا، اس کے لئے اُسوہ کیسے بنتا اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف نہ پہنچی ہوتی ۔

اس لفظ اُسوہ کو یہاں سمجھیے ۔ اللہ کر سکتا تھا ۔ اس نے نہیں کیا ۔ اس کا حکم تو یہی تھا کہ " اے محمدؐ جھیلو، برداشت کرو" ۔ اللہ کی شان بہت

علی وار قع ہے اسس لئے صرف بطور تفہیم بہت ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں کہ اگر ہم اپنے احساسات پر قیاس کریں تو کیا بیتی ہوگی اللہ پر ! جب طائف میں اس کا محبوب پتھروں کی زد میں تھا — جب تالیاں پٹ رہی تھیں — لیکن اسس کا فیصلہ یہی تھا کہ اے محمدؐ صبر کرو، جھیلو، برداشت کرو — وہی بات جو آں جنابؐ اپنے صحابہؓ سے کہہ رہے ہیں — جیسا کہ میں آل یاسر پر ظلم و ستم کے واقعہ کے دوران آپ کو سنا چکا ہوں اسی طرح مکی دور میں مختلف مصائب و شدائد اور ایذا رسانی جور و تعدی طنز و استہزاء کے مختلف مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وحی الٰہی کے ذریعے یہ ہدایات مل رہی ہیں کہ : وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ — فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا — فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُولُونَ — مختلف اسالیب سے صبر کی ہدایت اور تلقین — فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ "جیسے ہمارے اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے ویسے آپ بھی صبر کیجئے" — وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ "صبر کیجئے اور آپ کا سہارا بس اللہ ہی ہے —" یعنی صبر کے لئے بھی کوئی سہارا چاہئے تو آپ کا سہارا ہم خود ہیں — فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ — "پس صبر کیجئے اور اپنے رب کے حکم کا انتظار کیجئے کہیں مچھلی والے کی طرح جلدی نہ کر لیجئے گا"۔ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِينَ — "اور صبر کیجئے اللہ محسنین یعنی خوب کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا"۔ یہ سب کچھ کیوں ہے ؟ اس کو جانیئے اور سمجھئے، یہ اس لئے ہے کہ جناب محمدؐ کی ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے لئے اُسوہ بننا تھا — یہ سب کچھ نہ ہوتا تو آپؐ کی ذات گرامی ہمارے لئے اُسوہ کیسے بنتی ! — یہ محمد پر حجت ہے — آپ پر حجت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا، وہ خالص انسانی سطح (HUMAN LEVEL) پر کیا ہے : سارے دکھ اٹھا کر کیا ہے — فاقے جھیل کر کیا ہے — پتھراؤ برداشت کر کے کیا ہے — قید و بند کی تکالیف اٹھا کر کیا ہے، اپنے دندان مبارک شہید کروا کر کیا ہے — اپنے عزیزوں اور جاں نثاروں کے لاشے

اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کیا ہے - پیٹ پر ایک نہیں دو پتھر باندھ کر کیا ہے -
یہ سارے مصائب جھیلے ہیں، تب انقلاب برپا ہوا ہے اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ
وسلم نے جو تکالیف برداشت کیں، جب ہی یہ سب ہمارے لئے اُسوہ اور قابل
اتباع سُنّت بنا — لہٰذا غور کیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ مطہرہ کا سب
سے زیادہ نمایاں اُسوہ کیا ہوا؟ یہ ساری گفتگو لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ
رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ کے تحت ہو رہی ہے - یہ دو اسوے تو ہوئے
مجموعی اُسوے — یعنی بحیثیت مجموعی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد
خالصتاً انقلابی جدوجہد کے مشابہ ہے - یہ پہلا اُسوہ ہے دوسرا اُسوہ یہ ہے

یہ ساری جدوجہد انسانی سطح (HUMAN LEVEL) پر قدم بقدم مصائب و تکالیف، جور و تعدی اور ظلم و ستم جھیل کر ہوئی ہے -

اس موقع پر مبادا کوئی اشکال پیدا ہو جائے یا مغالطہ لاحق ہو جائے لہٰذا
عرض کر دوں کہ اللہ تعالےٰ کی نصرت و تائید آئی ہے - لیکن اس نصرت و تائید کا
دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہے — ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو — اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

نصرت و تائید کب آئی ہے؟ یہ اس وقت آئی ہے جب مومنین صادقین جو کچھ کر
سکتے تھے وہ سب کر گزرے - اس سے پہلے نصرتِ الٰہی نہیں آیا کرتی - اس نصرت
کی لازمی شرط تو یہ ہے کہ: یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ
وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ (سورۃ محمد) "اے ایمان والو! اگر تم اللہ کے (دین)
کی مدد کرو گے تو وہ تعالےٰ تمہاری مدد کرے گا" غزوہ بدر کے موقع پر جنگ سے ایک
رات قبل نبی اکرم ؐ نے دُعا فرمائی تھی کہ "اے اللہ! میں نے پندرہ برس کی کمائی
لا کر میدان میں ڈال دی ہے - اگر کل یہ شہید ہو گئے تو دنیا میں تیرا نام لینے والا
کوئی نہیں ہو گا، اس لئے کہ میں آخری رسول ہوں اور میری پندرہ برس کی
کمائی یہ ہے جو دین کی سربلندی کے لئے میں نے میدان میں لا ڈالی ہے -" چنانچہ

بدر کے معرکہ میں اللہ کی نصرت آئی اور ۳۱۳ بے سروسامان مومنین صادقین کے ہاتھوں کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار لشکر کو شکست نصیب ہوئی۔ لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ بچ بچ کر اور تحفظ کا خیال رکھ رکھ کر اور اپنی جیبوں کو سکیڑ سکیڑ کر رکھنے کے ساتھ ہم یہ امید رکھیں کہ اللہ کی تائید و نصرت ہمیں حاصل ہو جائے تو ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اپنے حلوے مانڈے میں ہم کوئی کمی کرنے کے لئے آمادہ نہیں، کاروبار میں سود شامل ہے تو اس کو چھوڑنے کے لئے ہم تیار نہیں کیونکہ اس طرح تو کاروبار سمٹ اور سکڑ جائے گا۔ دین کے کام کے لئے وقت لگائیں تو پھر ہمارا یہ معیار اور STATUS کیسے برقرار رہے گا! ۔ ہم تو بچ بچ کر آرام سے گھروں میں بیٹھے رہیں اور یہ چاہیں کہ اللہ اپنی نصرت و تائید لئے ہمارے پیچھے پیچھے آئے کہ لیجئے میری نصرت و تائید قبول فرمالیجئے، تو یہ ہونے والی بات نہیں ہے ۔ ع
این خیال است و محال است و جنوں است ۔ یہ کبھی نہ ہوا ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ساتھ نہیں ہوا تو ہمارے سر پر کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے کہ ہمارے ساتھ یہ معاملہ ہو جائے گا۔ کبھی نہیں ہو سکتا ۔ ہوتا تو نبی اکرمؐ کے ساتھ ہوتا۔ اس معاملے میں استثناء (EXCEPTION) اگر ہوتا تو اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ آپؐ ہی ہو سکتے تھے۔

نصرت و تائید کی بات چل رہی تھی تو آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ یوم طائف کے موقع پر نبی اکرمؐ نے جو دعا کی تھی جس کے بارے میں یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ : ع اجابت از در حق بہر استقبال می آید ۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ فوراً ملک الجبال حاضر ہوتا ہے، وہ فرشتہ جو پہاڑوں کی دیکھ بھال کیلئے مامور ہے اور عرض کرتا ہے کہ "حضور! اللہ نے مجھے آپؐ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ اگر آپ حکم دیں تو میں ان پہاڑوں کو ٹکرا دوں جن کے مابین وادی میں طائف کا شہر واقع ہے تاکہ اس کے رہنے والے پس کر سرمہ بن جائیں" ۔۔ اس پر رحمۃ للعالمین ارشاد فرماتے ہیں کہ "میں لوگوں کے عذاب کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ اگرچہ یہ لوگ مجھ پر ایمان نہیں لاتے لیکن کیا عجب! ان کی آئندہ نسلوں کو اللہ تعالیٰ

ایمان کی توفیق عطا فرماتے"۔ دیکھ لیجیے کہ جس موقع پر غیبی نصرت بھیجی گئی وہ کون سا موقع تھا؟ یہ وہ موقع تھا کہ جس سے زیادہ سخت دن خود حضورؐ کے بقول آپؐ کی زندگی میں کوئی اور نہیں گزرا ۔ اس سے پہلے بھی خفی غیبی امداد و نصرت ہوئی ہے ۔ لیکن نصرت الٰہی کا اصل ظہور ہوتا ہے یوم طائف کے بعد ۔ فوری طور پر تو ملک الجبال کی حاضری ہے ۔ لیکن اب ٹھنڈی ہوائیں یثرب کی طرف سے آنے لگیں ۔ آپؐ تو مکہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے لیکن نصرت و حکمت الٰہی نے مدینہ منورہ کی طرف کی کھڑکی کھول دی ۔۔ یوم طائف کے سلسلہ میں مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنی کتاب "النبی الخاتم" میں بہت ہی عمدہ نکتہ ارشاد فرمایا ہے کہ "یوم طائف نبی اکرمؐ کی زندگی کا TURNING POINT تھا ۔ اس دن تک اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبیؐ کو دشمن کے حوالے کیا ہوا تھا کہ جس طرح چاہو ہمارے رسولؐ کے صبر کا امتحان لے لو، جس طرح چاہو اُن کی استقامت کو جانچ پرکھ لو ہمارے رسولؐ کی سیرت و کردار کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لو ۔۔ اُس دن کے بعد نبی اکرمؐ کے لئے خصوصی نصرت اور تائید الٰہی کا ظہور شروع ہوتا ہے ۔"

اب آیئے میں سیرت مطہرہ اور خاص طور سے اس اسوہ حسنہ کے اُن تین مراحل کے اعتبار سے ایک تجزیہ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں ۔ جن کا میں نے آغاز میں ذکر کیا تھا ۔۔ اس کے بعد میں نے جو دو باتیں آپ کے سامنے بحیثیت مجموعی بیان کی ہیں کہ محض آرزو یا مرثیہ پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا ۔۔ دین کا دل میں درد ہے تو کچھ کرو ۔ ہمیں مرثیہ پڑھنا اور رونا بہت آتا ہے ۔ لیکن اگر یہ رونا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتماعی اُسوہ حسنہ کے ساتھ ہو تو یہ سونا ہے، اُس کے مطابق عمل نہیں ہے تو یہ ٹسوے ہیں، جو عورتیں بہایا کرتی ہیں، جنکی دنیا میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے ۔۔ اب ذرا ان تین اجزا کو لیجیے، جن کو میں نے دو دو لفظوں کے جوڑوں کے ساتھ تین مراحل کے عنوانات کے تحت آپ کے سامنے پیش کیا تھا ۔

سب سے پہلی بات یہ کہ "دعوت و تربیت" کے ضمن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کا اُسوہ یہ ہے کہ ان دونوں کاموں کا مرکز، مبنیٰ، مدار اور محور قرآن اور صرف قرآن رہا ہے۔ لوگوں کو ایمان کی دعوت دو، قرآن کے ذریعے ۔۔ تذکیر کرو قرآن کے ذریعے ۔ انذار کرو قرآن کے ذریعے ۔ تبشیر کرو قرآن کے ذریعے نصیحت اور موعظت کرو قرآن کے ذریعے ۔ بحث و مباحثہ اور جدال و محاجہ کرو، اس قرآن کے ذریعے ۔ تبلیغ کرو قرآن کی ۔۔ دعوت کے لئے یہی الفاظ ہیں اور کون سے الفاظ آئیں گے ۔ اب ذرا ان الفاظ کے مطابق ہدایات الٰہی سنئیے جو قرآن حکیم میں نازل ہوئی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ وقت کی قلت کی وجہ سے مجھے چند آیات پیش کرنے پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا ۔۔ فرمایا:

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝ (قٓ) "پس یاد دہانی کراؤ تذکیر کرو بذریعہ قرآن ہر اُس شخص کو جو میری پکڑ اور سزا سے ڈرتا ہو"۔۔ وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (الانعام) "اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں بھی اس کے ذریعے تم کو خبردار کروں اور وہ بھی جن کو یہ (قرآن) پہنچے"۔ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۝ (مریم) "پس ہم نے اس کتاب کو (اے نبی) آپؐ کی زبان میں اس لئے سہل آسان بنایا کہ آپؐ اس کے ذریعے خدا ترسوں کو بشارت پہنچا دیں اور جھگڑالو قوم کو اس کے بُرے انجام سے آگاہ اور خبردار کر دیں"۔۔ اس آیت میں خاص بات نوٹ کرنے کی یہ ہے کہ تُبَشِّرَ کے ساتھ بھی 'بِهٖ' اور تُنْذِرَ کے ساتھ بھی 'بِهٖ' ۔۔ یعنی دونوں کام بشارت و انذار اسی کتاب "قرآن" کے ذریعے ہوں گے ۔ ابھی اور دیکھئے فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ (المائدہ) "اے ہمارے رسول! پہنچا دیجئے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپؐ کی طرف آپؐ کے رب کی جانب سے"۔۔ تبلیغ کس کی؟ قرآن کی ۔ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ ۔۔۔ (بنی اسرائیل) "بے شک یہ قرآن اُس راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور بشارت دیتا ہے ان اہل ایمان کو جو نیک عمل

کرتے ہیں ۔۔۔۔" ___ تبشیر دینے والا کون؟ قرآن ___ اس انذار اور تبشیر بالقرآن کا ذکر سورہ کہف کے آغاز ہی میں بڑے مہتم بالشان انداز میں ہوا۔ فرمایا: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِهِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّهٗ عِوَجًا ؕ﴿ؔ۱﴾ قَیِّمًا لِّیُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِیۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡهُ وَ یُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا ۙ﴿۲﴾ "شکر کا سزاوار ہے وہ اللہ، جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں اس نے کوئی کجی نہیں رکھی۔ بالکل سیدھی اور ہموار و استوار، تاکہ وہ اپنی جانب سے جھٹلانے والوں کو ایک سخت عذاب سے آگاہ کرے اور ایمان لانے والوں کو، جو نیک عمل کر رہے ہیں، اس بات کی خوشخبری سنا دے کہ ان کیلئے بہت اچھا اجر ہے" ___ میں نے جو آیات آپ کو سنائیں۔ ان سب کا حاصل یہ نکلا کہ:۔

دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مرکز و محور مبنیٰ و مدار صرف اور صرف قرآن ہے، انذار ہو یا تبشیر، تبلیغ ہو یا تذکیر، مباحثہ ہو یا مجادلہ، موعظہ ہو یا نصیحت۔ یہ تمام کام صرف قرآن مجید ہی کے ذریعے سرانجام دیتے جائیں گے!!

'دعوت' کا لفظ "ہمارے دین کی غالباً سب سے جامع اصطلاح ہے۔ جس کے ضمن میں سورہ نحل کی اس آیت سے استشہاد کیا جا سکتا ہے، جس میں 'دعوت' کے ضمن میں یہ جامع و مانع ہدایت دی گئی کہ: اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَ جَادِلۡهُمۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ ؕ "دعوت دو، بلاؤ، پکارو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور موعظہ حسنہ کے ساتھ اور مباحثہ و مجادلہ کرو اس طور سے جو نہایت ہی عمدہ ہو" یہ ہے اسوہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ___ سیرتِ مطہرہ میں پڑھ

لیجئے - کہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طویل تقریر و خطاب فرمایا ہو - !جہاں تشریف لے گئے تو یہی فرمایا کہ " میرے اوپر اللہ کی طرف سے ایک کلام نازل ہوا ہے اُسے سن لو" ــــ معلوم ہوا کہ فلاں وادی میں کوئی قافلہ آکر اترا ہے تو وہاں تشریف لے گئے اور فرمایا تو یہ فرمایا کہ "لوگو! میرے پاس اللہ کا اتارا ہوا کلام ہے، وہ میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں"۔ مجمعوں میں آپؐ قرآن پڑھا کرتے تھے - یہ تو ہمیں مصیبت ہے کہ قرآن کا ترجمہ کرو - اس کا مطلب اور مفہوم سمجھاؤ وہاں معاملہ یہ تھا کہ از دل خیزد بر دل ریزد - وہاں تو حال یہ تھا کہ نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے قرآن سنا اور سعید روح کے قلب و ذہن اور رگ و پے میں سرایت کر گیا - قرآن اور محض قرآن سن کر جو جلیل القدر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مشرف بہ ایمان ہوئے ان کے نام گنوانے لگوں تو بڑی طویل فہرست ہو جائے گی - عمر بن الخطاب کو عمر فاروق رضی اللہ تعالٰی عنہ بنایا کس نے ؟ قرآن نے ، ؏ دگر گوں کرد تقدیر عمرؓ را ــ یہ سورہ طٰہٰ کی معجز نمائی تھی، جس نے عمرؓ کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا ــــ

ابو ذر غفاریؓ کو جو ڈکیتی کا پیشہ رکھنے والے ایک قبیلے کے فرد تھے اس مقام تک کس نے پہنچایا کہ "رہزنان از حفظ او رہبر شدند" جن کے متعلق نبی اکرمؐ فرماتے ہیں کہ جس نے زہد عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھنا ہو تو میرے ساتھی ابو ذرؓ کو دیکھ لے"۔ قرآن نے ــــ لبیدؓ شعرائے سبعہ معلقہ کے سلسلے کے آخری شاعر ہیں، ان کے ایک شعر پر سوقِ عکاظ میں تمام شعرائے وقت نے ان کو سجدہ کیا تھا ــ وہ ایمان لے آئے - قرآن کے ذریعے ــ کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ اب شعر نہیں کہتے تو جواب ملا کہ : أَبَعْدَ الْقُرْآن یعنی قرآن کے نزول کے بعد میری یہ مجال کہ میں شاعری کے میدان میں طبع آزمائی کروں ــ طفیلؓ دوسی یمن کے رہنے والے خود قادر الکلام شاعر ــ جب مکہ آئے تو قریش کے بہکانے پر کانوں میں روئی ٹھونس لی کہ مبادا کانوں میں کلام اللہ پڑ جائے - لیکن ایک دن خود ہی رسالت مآبؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآن سننے کی فرمائش کرتے ہیں اور یہ جیسے ہی کچھ حصہ سنتے ہیں - بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں کہ یہ کسی

انسان کا کلام ہو ہی نہیں سکتا — بے شک یہ وحی الٰہی ہے — اور اسی وقت مسلمان ہو جاتے ہیں — الغرض اس کتاب کے طفیل، جو رہزن تھے رہبر بن گئے، جو اُمّی تھے، اَن پڑھ تھے وہ دُنیا کے لئے معلّم بن گئے۔ جو زانی و شرابی تھے — وہ عصمتوں کے محافظ اور مکارم اخلاق کے علمبردار بن گئے۔ یہ سب کچھ قرآن کی معجز نمائی تھی — میری اس گفتگو کا نتیجہ بھی یہ نکلا کہ :۔

گویا دعوت و انقلاب نبویؐ کا اساسی منہج عمل پورا کا پورا قرآن مجید کے گرد گھومتا ہے۔ یا سادہ الفاظ میں یوں کہہ لیا جائے کہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آلۂ انقلاب ہے، قرآن حکیم!

اس بات کو مولانا حالی مرحوم نے تو نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں یوں بیان کیا کہ ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا — اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی — عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

اسی بات کو علامہ اقبال مرحوم نے یوں سمو دیا کہ ؎

مصطفےٰ اندر حرا خلوت گزیں — قوم و آئین و حکومت آفریں

پھر علامہ مرحوم نے حد درجہ پُرشکوہ الفاظ میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے کہ:

؎ گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن!
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں وہم پیدا ست اُو — زندہ و پائندہ و گویا ست اُو
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

اب ایک بات اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ اگر کوئی دعوت اس قرآن سے پرے پرے دی گئی ہو — قرآن کو BY PASS کر کے دی گئی ہو — قرآن کے بجائے کسی شخصیت کے لٹریچر کے بل پر چل رہی ہو — کسی اور کی تصانیف پر چل رہی ہو، وطنیت و قومیت کے نام پر چل رہی ہو تو وہ اُسوۂ رسول سے ہٹی

ہوئی ہے ۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کہتا ــــ اُسوۂ رسول کیا ہوگا! وہ یہ ہوگا کہ دعوت و تبلیغ، انذار و تبشیر ۔ تلقین و نصیحت ان سب کا مبنیٰ، مدار، مرکز و محور صرف اور صرف قرآن ہوگا ــــ اُسوہ حسنہ کے ضمن میں تیسری بات یہ نوٹ کر لیجئے ۔

اب آیئے چوتھی بات کی طرف ۔ وہ ہے **تربیت** ۔ یہ معاملہ سب سے زیادہ تکلیف دہ معاملہ ہے ۔ تزکیۂ نفس کے بارے میں تو یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ شاید اس کے لئے یہ قرآن تو مفید ہے ہی نہیں ــــ یہ کتاب اللہ اس کام کیلئے مؤثر ہی نہیں ہے ۔ لہٰذا ذکر کے طریقے کچھ اور ایجاد کرنے پڑیں گے ۔ تربیت کا کوئی دوسرا انتظام بنانا پڑے گا ۔ نبی اکرمؐ کا اُسوہ تو اس کے لئے مکمل رہنمائی نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے دلیل یہ دی گئی ہے کہ آں حضورؐ کی شخصیت کا جو اثر ہوتا تھا وہ اب ہمارے لئے ممکن نہیں ہے چونکہ آپؐ کا وجود قدسی ہمارے درمیان موجود نہیں ۔

لہٰذا اس کے لئے کچھ اور طریقے سوچنے اور اختیار کرنے ہوں گے ۔ اس حلقے میں جو دیانت دار اور خدا ترس لوگ ہیں، وہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ جو چیزیں اور طریقے ہمارے ہاں تربیت، تزکیہ اور سلوک کے رائج ہیں، وہ مسنون بہر حال نہیں ہیں، تصوف کے جتنے بھی دین سے قریب تر سلاسل ہیں، وہ سب اس بات کو مانتے ہیں ــــ دیانت کا تقاضا ہے کہ ہم بھی اس کو تسلیم کریں۔ ہم کہاں سے دلیل لائیں گے کہ ضربیں لگانے کے طریقے کو مسنون ٹھہرا سکیں۔ یہ بات بہر حال نہ کسی حدیث سے ثابت ہے نہ کسی صحابی سے نہ کسی تابعی سے ۔ جو حضرات اس کے قائل ہیں وہ زیادہ سے زیادہ جو عذر و معذرت یا 'PLEA' لاتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ان طریقوں کو انہوں نے اپنے تجربات میں مفید پایا ہے ۔ ٹھیک ہے، مجھے اس سے انکار نہیں ۔ ایسا ممکن ہے کہ یہ طریقے مفید ہوں ۔ لیکن یہ مانئیے اور اس کا اعلان بھی کیجئے کہ یہ طریقے مسنون نہیں ہیں ۔ یہ طریقے اُسوۂ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے مطابقت نہیں رکھتے ــــ کیا ایسے حضرات کا یہ خیال ہے کہ جناب محمدؐ نے تزکیہ نہیں کیا!

صلی اللہ علیہ وسلم ۔ قرآن حکیم میں تین مقامات پر تلاوت کے بعد تزکیہ ہی کا ذکر آتا ہے ۔ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ ۔۔۔ اس تزکیہ کا ذریعہ کیا ہے؟ دعوت و تبلیغ کا مدار اور انذار و تبشیر کا مرکز و محور قرآن ہے اور تذکیر و نصیحت کا مبنیٰ بھی قرآن ہی ہے، اس بات کو تو آپ نے قرآن کی آیات ہی سے سمجھ لیا۔ اس کے سمجھنے کا معاملہ آسان ہے البتہ تزکیہ کا معاملہ تھوڑا سا باریک ہے ۔ تزکیہ و تربیت کے لئے بھی آپ کو ہر حال میں قرآن ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ آئیے اس بات کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ سورۂ یونس میں فرمایا: یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ مَّوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ ۔ دل کے تمام امراض دینیہ و اخلاقیہ کے لئے شفاء یہ قرآن مجید ہے ۔ ذکر یہ قرآن ہے: اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (الحجر) جو ذکر اس کو BY PASS کرے گا، اس کے متعلق میں کم سے کم یہ کہونگا کہ وہ غیر مسنون طریقے پر عمل کر رہا ہے۔ امراض قلبیہ و صدریہ کا علاج اس سے علیحدہ کیا جائے گا وہ اسوہ رسولؐ نہیں ہوگا۔ اپنی جگہ مؤثر ہوا کرے ۔ اسوۂ رسول کے نقشے سے وہ ہٹا ہوا ہے ۔

دیکھئے ہمارے ہاں ایک ہے 'وعظ' ۔ یہ وعظ ہمارے ہاں گالی بن گیا ہے۔ لوگ پھبتی چست کرتے ہیں، لو جی وعظ کہہ رہے ہیں، گویا بہت گھٹیا سی بات کہی جا رہی ہے ۔ یہ دور دور کی چھاپ ہوتی ہے ۔ ایک زمانے میں ایسے وعظ ہوا کرتے تھے جو بہت مؤثر ہوتے تھے ۔ سامعین ان سے اپنے قلوب میں گداز اور ایک روشنی محسوس کرتے تھے، ان کے جذبات کو جلا ملتی تھی ۔ اب یہ وعظ گالی بن گیا ہے ۔ لیکن ہمارے ہاں میری یادداشت کے مطابق جو 'وعظ' ہوا کرتے تھے ان میں بھی قرآن نہیں ہوتا تھا (الا ماشاءاللہ) اکثر وعظ 'مثنوی مولوی معنوی' کی بنیاد پر ہوتے تھے ۔ اس کی بھی ایک تاثیر تھی اس سے انکار نہیں ۔ لیکن اکثر ہوتا یہی تھا کہ ایک خاص ترنم آمیز لہجے میں مثنوی کو پڑھا جاتا تھا ۔ میرے ہوش کے زمانے میں اکثر وعظوں کی یہی نوعیت ہوتی تھی جو میں نے خود سنے ہیں ۔۔۔ قرآن کہتا ہے کہ موعظہ حسنہ

اور نصیحت یہ قرآن ہی ہے - دلوں میں اترنے والی چیز یہ قرآن ہے، جذبات کو جلا بخشنے والی چیز یہ قرآن ہے : قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ - ان حقائق کو علامہ اقبال مرحوم نے اپنے زمانے میں خوب واضح کیا ہے جیسا کہ انہوں نے بہت سے قرآنی حقائق کی اپنے اشعار میں نہایت عمدہ، اعلیٰ وارفع ترجمانی اور وضاحت کی ہے — چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎ معنی اُو پست و حرف اُو بلند

الفاظ بڑے بھاری بھرکم اور معنی تلاش کرو تو ہیں ہی نہیں — دھواں دھار بات ہے لیکن معنی سے بالکل خالی — آگے علامہ کہتے ہیں ؎

از خطیب و دیلمی گفتارِ اُو — با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو

اپنے وعظوں کے لئے حدیث لائیں گے تو کوئی بہت ہی ضعیف یا شاذ حدیث لائیں گے - واعظوں کی یہ بڑی کمزوری تسلیم کی گئی ہے کہ ان کے وعظ میں اکثر و بیشتر کمزور و ضعیف حدیثیں ہوتی ہیں - امام غزالیؒ اس سے نہ بچ سکے - "احیاء العلوم" جیسی کتاب بھی اس سے مبرّا نہیں - البتہ اس میں یہ بات ہے کہ وہ کسی موضوع پر آٹھ حدیثیں صحیح درج کرنے کے بعد دو تین ضعیف حدیثیں بھی شامل کر دیتے ہیں - پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا! شاید ان کا جی بھرتا نہیں تھا اور وہ چاہتے تھے کہ دو تین دلیلیں اور دوں - حالانکہ وہ بات صحیح احادیث سے ثابت ہو جاتی تھی - لیکن پھر بھی وہ کچھ ضعیف احادیث بھی لے آتے تھے - لیکن ہمارے ہاں جو عام واعظین ہیں ان کا حال یہ ہے کہ ساری گفتگو اور وعظ کا مرکز و محور صرف ضعیف احادیث ہوگا - اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہ - وہ خطیب بغدادی کی ہوگی یا دیلمی کی ہوگی - وہ شاذ ہوگی یا مرسل ہوگی یا ضعیف ہوگی ؎

از خطیب و دیلمی گفتارِ اُو — با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو

مطلب کیا ہے کہ اگر کسی چیز سے ہمارے واعظین کو اعتنا نہیں ہے تو وہ یہ قرآن ہے — مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنے والد مرحوم کے یہ حد درجہ سادہ مگر پُر تاثیر اشعار حواشیٔ ترجمہ قرآن میں درج کیے ہیں ؎

سنتے سنتے نغمہ ہائے محفلِ بدعات کو — کان بہرے ہو گئے دل بے مزہ ہونے کو ہے
آؤ سنوائیں تمہیں وہ نغمہ مشروع بھی — کہ جس سے خاشعاً متصدعاً ہونے کو ہے

میں ان اشعار کے حوالے سے ابھی کراچی میں یہ بات کہہ کر آیا ہوں جو مجھے اس وقت یاد آ گئی کہ ایک محفلِ سماع جناب محمد کی بھی ہوتی تھی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ لیکن اس میں کیا سنا جاتا تھا! قرآن — وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا (الاعراف) "اور جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے، دھیان سے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔" حدیث صحیح موجود ہے حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ ان سے فرمائش کر کے نبی اکرم ﷺ نے قرآن کریم سننا چاہا تو انہوں نے عرض کیا کہ حضور آپ کو سناؤں! آپ پر تو قرآن نازل ہوا ہے۔ لیکن آں جناب نے فرمایا کہ ہاں سناؤ، مجھے دوسروں سے سن کر حظ اور لطف حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن مسعود نے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی اور جب اکتالیسویں آیت پر آئے تو حضور نے روکا حَسْبُكَ، حَسْبُكَ۔ بس کرو، بس کرو۔ حضور کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے جب حضرت عبداللہ نے یہ آیت پڑھی: فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا "پس سوچو کہ اس وقت کیا ہو گا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر (اے محمدؐ) تمہیں گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔" یہ ہے سماع جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ وعظ کا مقصد کیا ہے؟ اجزائے کے اندر ایک حرارت پیدا کرنا۔ کیا یہ حرارت قرآن سے پیدا نہیں ہوتی؟ گویا اس طریقے سے تزکیہ نفس، کے لئے تو غالباً یہ دنیا کی ناکام ترین کتاب سمجھی گئی ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ نہایت افسوس کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ قرآن حکیم کی سب سے زیادہ ناقدری اس کوچے میں آ کر ہوئی ہے۔ اس کا مرثیہ بھی اقبال نے کہا ہے ۔۔

صوفیٔ پشمینہ پوش حال مست — از شراب نغمہ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش — در نمی سازد بقرآں محفلش

عراقی کا جامی کا یا رومی کا شعر سنیں گے تو حال میں آجائیں گے۔ قرآن سُنیں گے تو کوئی اثر ہی نہیں ہوگا بلکہ قرآن ان کی محفلوں میں جگہ ہی نہیں پاتا۔ آخر یہ کیا مصیبت ہے۔ حالانکہ اگر جذبات کی جِلا، ان میں حرارت اور سوز و گداز و کیف و سرور کی کیفیات مطلوب ہوں تو اس مقصد کے لئے بھی یہ قرآن ہے جو جناب محمد پر اترا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان کے لئے بھی سب سے بڑا منبع و سرچشمہ قرآن مجید ہی ہے۔

اُسوۂ حسنہ کے ضمن میں اب تک قدرے تفصیل کے ساتھ میں نے جو اُسوے گنوائے ہیں، انہیں پھر ذہن میں تازہ کر لیجئے۔ پہلا اُسوہ ہے، دعوت و تبلیغ و انذار و تبشیر و موعظہ و تذکیر ان سب کو جمع کر لیجئے ان سب کا مرکز و محور، مبنیٰ و مدار ہے قرآن — دوسرا اُسوہ ہے تزکیہ و تربیت اُس کی اساس، جڑ اور بنیاد بھی قرآن ہی ہے۔ ذکر قرآن سے۔ محفل سماع قرآن سے۔ وعظ قرآن سے۔ تطہیر فکر قرآن سے ہوگی اور فکر کی تطہیر ہوگی تو اعمال خود بخود درست ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ انسانی شخصیت مجموعہ ہے فکر و عمل کا اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں بایں معنی کہ "گندم از گندم بروید، جو ز جو" کے مصداق غلط فکر، غلط عمل ہی کو جنم دے سکتا ہے اور صحیح عمل کے لئے صحیح فکر لازم و لابد ہے گویا اگر کسی انسان کی فکر کی تطہیر ہو جائے اور غلط افکار، نظریات اور فاسد خیالات اس کے قلب و ذہن سے پت جھڑ کے پتوں کی طرح جھڑتے چلے جائیں — تو اعمال صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کے برگ و بار بلا تکلف از خود نمایاں ہو جائیں گے۔ اسی عمل (PHENOMENON) کو قرآن حکیم "یُکَفِّرْ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ" بھی قرار دیتا ہے اور "یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ" بھی۔ اور یہی ربط و تعلق ہے اس میں کہ تلاوت آیات کے متصلاً بعد تزکیہ کا ذکر قرآن میں آیا ہے: یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ — واللہ اعلم۔

اب آئیے دوسرے مرحلے کی طرف یعنی تنظیم و ہجرت — تنظیم کے ضمن میں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا اسوہ رہا ہے! اب اس مسئلہ کو ہمیں سمجھنا ہے۔

اس میں تو کوئی شک نہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی ایسا فاتر العقل شخص اس مجلس میں نہیں ہوگا جو یہ سمجھتا ہو کہ تنظیم کے بغیر بھی کوئی اجتماعی کام ہو سکتا ہے! میں نے کراچی میں کہا اور آپ بھی سن لیجئے کہ اگر آپ کو لوگوں کی جیبیں کاٹنی ہوں تو بھی ایک تنظیم قائم کرنی پڑے گی۔ گرہ کٹوں کے بھی گروہ (GANGS) ہوتے ہیں۔ ڈاکہ ڈالنا ہو تو (GANG) بنانا ہوگا۔ سوشلزم لانا ہو تو آپ کو تنظیم بنانی ہوگی۔ اور اگر اسلام کے لئے کوئی کام کرنا ہے تو بھی تنظیم سے مفر نہیں ہے۔ اچھی طرح جان لیجئے لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ یہ حضرت عمرؓ کا قول ہے اور نبی اکرمؐ کا تو حکم ہے کہ اَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ : بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ۔ ہمارا آج کا مزاج اس سے کافی بعید چلا گیا ہے۔ بڑے بڑے اہل دانش و بینش اور صاحب علم و فضل کہتے ہیں "آج جماعت کی کیا ضرورت ہے کام تو ہم بھی کر ہی رہے ہیں۔ نماز اور روزہ تو ہو ہی رہا ہے۔ کسی کی کوئی خدمت بھی کر دی جاتی ہے"۔ اگر واقعی کوئی کام کرنا ہے، اگر اُسوۂ محمدیؐ پیش نظر ہے اور انقلاب محمدیؐ کو دنیا میں دوبارہ لانے کی سعی و جہد کرنی ہے تب تنظیم سے رستگاری نہیں ہو سکتی، تنظیم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکے گا۔ آج کے دور کا سب سے کٹھن کام یہی ہے۔ دیکھئے قرآن مجید (سورہ مریم) میں عرب کے لوگوں کو قَوْمًا لُدًّا کہا گیا ہے۔ "یہ بڑی جھگڑالو قوم ہے"۔ ہر ایک اپنی جگہ پر فرعونِ بے ساماں ہے، کون کسی کی سنے گا! کون کسی کے سامنے سر جھکائے گا! آج کا دور بھی ایسا ہی دور ہے کہ سب سقراط و بقراط ہیں، کون کسی کی سنے گا! لوگوں کے اپنے اپنے نظریات ہیں، خیالات ہیں، اختلاف ہے، یہ ہے، وہ ہے — چنانچہ اس دور میں کسی نظم کا پابند ہونا سب سے کٹھن کام ہے۔ کسی کی بات مانی جائے، کسی کا حکم مانا جائے خود کو کسی ڈسپلن میں دے دیا جائے۔ سمع و طاعت کا نظم قبول کیا جائے یہ بڑا مشکل اور اوکھا کام ہے۔ میرے نزدیک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالٰی عنہٗ کی جو قربانیاں ہیں، ان میں سب سے بڑا ایثار یہی تھا کہ اپنی شخصیت کی کامل نفی تھی اور انہوں نے اس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس

میں گم کر دیا تھا۔ حالانکہ بہت سے دنیوی اعتبارات سے وہؓ نبی اکرمؐ سے آگے تھے۔ حضورؐ کے پاس اپنا ذاتی سرمایہ کوئی نہیں تھا: وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی o اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو جیب غنی کیا ہے تو سرمایہ اہلیہ محترمہ کا تھا۔ 'نقل کفر کفر نہ باشد' طائف والوں نے یہی طعنے تو دیئے تھے کہ اللہ کو ایک مفلس و قلاش کے سوا اپنا نبی بنانے کے لئے کوئی اور نہیں ملا تھا ــ مکہ والے بھی کہا کرتے تھے کہ اللہ کو نبی بنانا تھا تو دو عظیم شہروں (مکہ اور طائف) کے کسی صاحب ثروت سردار کو بنانا تھا ــ حضورؐ کے پاس قریش کے اُس قبائلی نظام کا کوئی منصب نہیں تھا ــ اور ابو بکرؓ کے پاس سب سے زیادہ SENSITIVE اور سب سے زیادہ TOUCHY یعنی نازک اور حساس ذمہ داری تھی ــ یعنی دیت کا فیصلہ کرنا آپؓ کے اختیار میں تھا کہ کسی مقتول کا کتنا خون بہا دیا جائے گا ــ گویا اُس معاشرے میں کسی کی معاشرتی حیثیت (SOCIAL STATUS) کے تعین کرنے کا کام آپ کے سپرد تھا ــ اس سے آپ اندازہ لگالیں کہ اُس معاشرے کے قبائلی نظام میں حضرت ابو بکرؓ کو کیا مقام حاصل تھا! لیکن انہوں نے اپنی شخصیت کی ایسی نفی کی ہے اور اس طرح گم کیا ہے اپنے آپ کو محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں کہ "ابو بکر" تو نظر ہی نہیں آتے ــــ نظر تو وہ آتا ہے جو اختلاف کرتا ہے ــ ایسے شخص کی شخصیت علیٰحدہ اور جدا نظر آئے گی جہاں کسی درجے میں اپنی بات کہی جائے۔ لیکن جس کی اپنی کوئی بات ہی نہیں ہے جو خود کو گم کر چکا ہو محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں، وہ کہاں نظر آئے گا ــ یہ ہے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سب سے بڑا ایثار اور سب سے بڑی قربانی ــ

آج جو سب سے بڑا خناس ہمارے دماغوں میں بیٹھا ہوا ہے وہ یہی انانیت ہے ــ کوئی نظم ہوگا اور کوئی تنظیم ہوگی تو بہر حال اس کے امراء اور اس کے نظام العمل کی پابندی بھی کرنی ہوگی ــ لہٰذا اپنے آپ کو اس "کھکیڑ" سے بچانے کے لئے یہ فلسفہ تراش لیا جاتا ہے کہ اجی کسی جماعت یا تنظیم کی ضرورت ہی کیا ہے، دین کا کام کسی نہ کسی درجے میں ہم بھی کر رہے ہیں

ہیں - جماعتیں اور تنظیمیں تو عموماً فتنہ بن جایا کرتی ہیں - اس لئے اس سے حذر ہی بہتر ہے - ان حیلوں سے دل کو مطمئن کر لیا جاتا ہے لوگ سڑک پر چلتے ہوئے حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں - لیکن اس کے باوجود باہر نکلنا ترک نہیں کر سکتے - دل میں اصل چور یہی ہے کہ میں کیوں کسی کی مانوں - لیکن یہ جان لیجئے کہ تنظیم و جماعت کے بغیر دنیا میں کبھی کوئی کام نہیں ہو سکتا --- اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ حسنہ کی روشنی میں مجھے تنظیم و ہجرت کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے --- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنظیمیں دو نوعیتوں کی تھیں ایک تنظیم کی نوعیت تو یہ تھی کہ آپؐ کے بربنائے نبی و رسول ہونے کے جو شخص آپؐ پر ایمان لے آیا - اس نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا تو وہ خود بخود بحیثیت مؤمن اور آپؐ کا مطیع و فرماں بردار ہو گیا ۔ اور آپ سے آپ اس بڑی تنظیم میں شامل ہو گیا جس کو اُمتِ مسلمہ سے موسوم کیا جاتا ہے --- اب کسی دوسری تنظیم کی حاجت ہی نہیں - ------ وہ حضورؐ کے احکام کا پابند ہے - اس سے سرِ مو انحراف کرے گا تو اس کا ایمان ہی سلامت نہیں رہے گا - اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا دُنیا میں وجود ممکن ہی نہیں ہے - دنیا میں ہر شخص کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو اختلاف ممکن نہیں - اختلاف کیا تو ایمان کی خیر نہیں رہے گی - اختلاف کرنا تو دور رہا، بات مان بھی لی ہے لیکن اگر دل میں کوئی اضطراب یا تنگی رہ گئی تو بھی ایمان کی خیر نہیں - فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ○ (النساء) "اے محمدؐ! آپؐ کے رب کی قسم یہ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں آپؐ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ آپؐ فیصلہ کریں اس پر اپنے دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں" - آپ حضرات نے دیکھا کہ آنجنابؐ کے حکم کو تسلیم نہ کرنے پر ہی نہیں بلکہ آپؐ کے فیصلوں کو خوش دلی سے قبول نہ کرنے پر بھی ایمان کی نفی کی جا رہی ہے اور اللہ اپنی ذات تبارک و

تعالےٰ کی قسم کھا کر نفی فرما رہے ہیں — پھر دیکھئے سورۃ الحجرات میں فرمایا:
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ
وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ
وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ "اے اہل ایمان! مت بلند کرو اپنی آوازوں کو
نبیؐ کی آواز پر اور نہ اُن سے گفتگو میں اپنی آواز کو اس طرح نمایاں کرو جس طرح
تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے بلند آوازی اختیار کرتے ہو مبادا
تمہارے سارے اعمال حبط و برباد ہو جائیں - تمہاری ساری نیکیاں اکارت
ہو جائیں - تمہارے اب تک کے کئے کرائے پر پانی پھر جائے اور تمہیں شعور و
احساس تک نہ ہو —" شعور و احساس جب ہوتا ہے جب انسان یہ سمجھے
کہ وہ نبی اکرمؐ کی کسی نافرمانی کا ارتکاب کر رہا ہے — غور کیجئے کہ یہاں نافرمانی
حکم عدولی اور معصیتِ رسولؐ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوا بلکہ مجرد سوئے ادب
کی وجہ سے سارے اعمال کے حبط ہونے کی وعید سنائی جا رہی ہے - اور آگے
چلئے اور دیکھئے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ نے اطاعتِ رسول کے لئے کتنا
محکم اور غیر مبہم ضابطہ و قانون بیان فرما دیا ہے: مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ
فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ - جس نے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت
کی پس اس نے اللہ کی اطاعت کی" - اسی ضمن میں خود نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کا قول بھی سن لیجئے کہ: لَا یُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰی یَكُوْنَ
هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ — "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا
جب تک اسکی خواہش نفس اس ہدایت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لیکر
آیا ہوں —" قرآن و حدیث کی یہ تعلیمات و ہدایات پیش نظر رکھئے اور غور
کیجئے کہ اس سے زیادہ مضبوط کسی اور تنظیم کا آپ تصور کر سکتے ہیں -!
واقعہ یہ ہے کہ میں نے اس مسئلہ پر کافی طویل عرصے تک بہت غور کیا
ہے اور آپ کو بھی غور و فکر کی دعوت دیتا ہوں کہ آپ بھی خوب اچھی طرح غور
کیجئے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع اور اوقات میں صحابہؓ سے
جو بیعتیں لی ہیں، ان کی ضرورت ہی نہیں تھی - نبی اکرمؐ تو اپنی ذات میں خود

مطاع ہیں پھر بیعت کی ضرورت کیا ہے؟ غزوۂ بدر سے پہلے جو مشاورت ہوئی ہے کہ قافلے کا رُخ کیا جائے جس میں صرف پچاس نفوس ہیں یا اس لشکر کا جو پوری طرح کیل کانٹے سے لیس اور ایک ہزار جنگجوؤں پر مشتمل ہے، تو اسی موقع پر ہی تو حضرت سعد ابن عبادہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے جو قبیلہ خزرج کے سرداروں میں سے تھے یہ بات کہی تھی کہ: اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ۔ "حضور! ہم آپؐ پر ایمان لاچکے آپؐ کی بحیثیت رسول اللہ تصدیق کرچکے اب کوئی OPTION ہمارے لئے کہاں رہ گیا ہے!" —— انہوں نے مزید عرض کیا کہ آپؐ ہمیں ساحل کے کنارے کھڑے ہو کر سمندر میں چھلانگ لگانے کا حکم دیجئے ہم تعمیل کریں گے — آپؐ ہمیں برق بماد تک (جو یمن کا ایک دور دراز علاقہ ہے) چلنے کا حکم دیجئے، ہم چلیں گے چاہے ہماری اونٹنیاں لاغر ہو جائیں — لیکن اس کے باوجود مختلف مراحل پر آپؐ نے بیعتیں کیوں لیں!— ؟ اس سوال کے جواب کو اس وضاحت سے سمجھئے جو میں پہلے پیش کرچکا ہوں کہ اللہ تعالےٰ اس پر قادر تھا کہ عرب میں انقلاب بھی آجاتا اور اپنے محبوبؐ کے پائے مبارک میں ایک کانٹا بھی نہ چبھتا۔ —— اللہ نے ایسا نہیں کیا — کیوں نہیں کیا؟ اس لئے نہیں کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلامی انقلاب کی انسانی سطح پر جدوجہد ہمارے لئے نمونہ بنے — اسی طرح صحابہ کرامؓ سے حضورؐ کو کسی بھی موقع پر بیعت لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی — لیکن بایں ہمہ آپؐ نے بیعتیں لیں تاکہ اُمّت کو معلوم ہو جائے کہ اسلامی نظم جماعت، کی بنیاد بیعت ہے — حدیبیہ کے موقع پر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر پہنچتی ہے تو نبی اکرمؐ صحابہ کرامؓ کو دعوت دیتے ہیں کہ آؤ کون عثمانؓ کے خون کا قصاص لینے کے لئے میرے ہاتھ پر سرفروشی کیلئے بیعت کرتا ہے! اس پکار پر چودہ ۱۴۰۰ سو جان نثار صحابہ کرامؓ لبیک کہتے ہیں۔ وہ تو حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر ہی غلط نکلی ورنہ صحابہ کرامؓ نے تو جان فروشی کے لئے خود کو پیش کرہی دیا تھا — اسی بیعت کا نام "بیعت رضوان" ہے۔ جس کا ذکر سورہ فتح میں بڑے مہتم بالشان طریقے سے دو جگہ آیا ہے — آیت نمبر ۱۰

میں فرمایا: إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ج — "اے نبی جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے تھے، وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے، ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ تھا"۔ آگے آیت نمبر ۱۸ میں ان بیعت کرنے والوں کو بایں الفاظ بشارت دی جاتی ہے کہ: لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝ "اللہ ان مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے (اے نبی!) آپ سے بیعت کر رہے تھے۔ اللہ کو ان کے دلوں کا حال معلوم تھا۔ اسی لئے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور ان کو قریبی فتح بخشی —" بیعت عقبۂ ثانیہ ہو رہی ہے کہ آپ سے عرض کیا جاتا ہے کہ حضورؐ آپ مدینہ تشریف لے آئیے ہم آپ کی اس طرح حفاظت کریں گے، جیسے اپنے بال بچوں کی کرتے ہیں — بیعت کرنے والے وہ ہیں جو پہلے ہی سے ایمان لا چکے ہیں — قول و قرار کے لئے بیعت ہو رہی ہے — معاہدے ہو رہے ہیں — احادیث میں مختلف بیعتوں کا ذکر ہے میں یہاں صرف ایک حدیث آپ کو سناتا ہوں، جس کے راوی ہیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ جس کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ اپنی اپنی 'صحیح' میں لائے ہیں گویا یہ حدیث متفق علیہ ہے جو حدیث کا سب سے بلند مقام و مرتبہ ہے حدیث کے الفاظ ہیں کہ: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ كُنَّا إِذَا بَايَعْنَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ يَقُولُ لَنَا فِيمَا اسْتَطَعْتُمْ۔ "ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سمع و طاعت کی بیعت کرتے تو آپؐ فرماتے کہ جس چیز کی تم طاقت رکھو"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ صحابہ کرامؓ سے مختلف اوقات میں مختلف کاموں کے لئے بیعت لیا کرتے تھے —

اس طرح بیعت کا یہ نظام ہمیں تعلیم دیا گیا ہے کہ یہ ہے درحقیقت اس تنظیم کی اساس و بنیاد کہ جو اس کام کو کرنے کے لئے منظم ہو جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امت کے حوالے کر گئے ہیں۔ یعنی عالمی سطح پر انقلاب محمدیؐ کا بول

بالا کرنا۔ اس کام کے لئے طریق تنظیم یہ بیعت کا نظام ہے۔ کوئی اللہ کا بندہ جب آگے آئے اور پکارے کہ "مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ" تو آپ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیں سمع وطاعت کی بیعت کریں ۔ فرق یہ ہوگا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بیعت کی جاتی تھی، وہ مطلق ہوتی تھی کہ جو حکم آپؐ دیں گے وہ واجب الاطاعت ہوگا۔ اس لئے کہ ع گفتۂ او گفتۂ اللہ بود۔ ان کا فرمان اللہ کا فرمایا ہوا تھا۔ اور مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ اب جو بیعت ہوگی، وہ مشروط ہوگی۔ اللہ اور اس کے رسول کی قائم کردہ حدود کے اندر اندر اطاعت ہوگی۔ اس کے باہر اطاعت نہیں ہوگی۔ الغرض یہ اطاعت "فی المعروف" کی شرط کے ساتھ مشروط ہوگی۔ پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا اسوہ ہے کسی تنظیم کے قیام کے لئے **نظامِ بیعت**۔

احیائے دین کے لئے یہ دستوری تنظیمیں اور الیکشنوں کے ذریعے قائم ہونے والی تنظیمیں اور امیر اور شوریٰ یا انتظامیہ کے لئے دو سال یا پانچ سال کے بعد الیکشن اور ان کے درمیان فرائض و اختیارات اور حقوق کا توازن قائم کرنے کے طریقہ کار کو میں کفر یا قطعی طور پر خلاف اسلام نہیں کہتا لیکن پورے شرح صدر کے ساتھ یہ ضرور کہتا ہوں کہ یہ طریق تنظیم اسوۂ رسولؐ کے مطابق نہیں ہے ۔ میں پھر عرض کر رہا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بیعت لینے کی احتیاج ہی نہ تھی۔ حضورؐ نے مختلف اوقات میں جو بیعتیں لیں وہ میرے نزدیک اس لئے تھیں کہ آئندہ کے لئے ہمیں روشنی ملے اور ہمارے لئے اسوہ بنے ۔ لہٰذا حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا نصب ہو رہا ہے تو بیعت کی بنیاد پر۔ حضرت عمرؓ کا ہو رہا ہے تو بیعت سے۔ حضرت عثمانؓ کا ہو رہا ہے تو بیعت پر۔ حضرت علیؓ کا نصب خلافت بھی بیعت سے ہوا ہے۔ اس کے بعد بیعتیں تقسیم ہوگئیں۔ یہاں تک تو بیعت ایک تھی۔ وہ دینی بیعت بھی، سیاسی بیعت بھی، اور انتظامی بیعت بھی تھی لیکن خلافت راشدہ اور امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد مروان ابن حکم سے یہ وحدت ختم ہوگئی اور بیعت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ چونکہ اس دور میں نام تو خلافت ہی رہا

لیکن اصلاً وہ تاریخ ملوکیت میں تبدیل ہو گئی اور خلفاء تقویٰ کے لحاظ سے اس معیار مطلوب کے مطابق نہ رہے جو خلفائے راشدین میں نظر آتا ہے لہٰذا بیعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی - ایک سیاسی بیعت یعنی خلیفہ وقت کی اطاعت کے لئے ہوتی تھی جو بتدریج ایک معروف کا درجہ حاصل کر گئی جو دور بنی اُمیّہ بنو عباس اور دور عثمانیہ تک ہمیں کسی نہ کسی صورت میں نظر آتی ہے — اور دوسری بیعت، بیعتِ ارشاد کسی بزرگ، خدا ترس، متقی، متدین مزکّی، و مربّی اور مُرشد کے ہاتھ پر ہونے لگی — پھر اس بیعت ارشاد کے بھی کئی سلاسل وجود میں آ گئے جیسے فقہی مسائل میں چار مسالک فقہ مشہور ہوئے اسی طرح انفرادی رشد و ہدایت اور تزکیہ و تربیت نفس کے لئے بھی چار سلاسل مشہور ہیں —

اس بات کو بھی سمجھ لیجئے کہ یہ دو بیعتیں اس وقت تک رائج رہیں جب تک شریعت اور قانونِ اسلامی کا ڈھانچہ قائم (INTACT) رہا - تا آنکہ وہ دور شروع ہوا جب ایک طرف وحدت ملّی پارہ پارہ ہوئی اور دوسری طرف متعدد مسلم ممالک براہ راست سیاسی طور پر مغربی استعمار کے استیلاء کے پنجے میں گرفتار ہو کر سیاسی طور پر غلامی سے دوچار ہوئے اور ہمارے دین کا برائے نام ڈھانچہ بھی برقرار نہ رہا اور پوری عمارت زمین بوس ہو گئی - شریعت اور اسلامی قانون مختلف ممالک میں مختلف ادوار میں منسوخ کر دیا گیا - قاضیوں کی عدالتیں برطرف کر دی گئیں تو ان حالات میں تجدید و احیائے دین کی تحریکیں اور تنظیمیں ابھرنے لگیں ادھر ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ دونوں بیعتیں یکجا جمع ہو گئیں - سوڈان میں مہدی سوڈانی اُبھرے - طرابلس (موجودہ لیبیا) میں سنوسی تحریک اُبھری نجد میں محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک اٹھی (جو وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہے) یہ تمام تحریکیں ہم دیکھتے ہیں کہ بیعت کے نظام بر سمع و طاعت، ہجرت و جہاد کے لئے بپا ہوئیں اس طرح ہمیں ان تحریکوں میں اس بیعت کی سنت کی تجدید نظر آتی ہے -

سیّد احمد بریلویؒ کی تحریک میں عجب شان نظر آتی ہے - وہ مسلک کے

اعتبار سے حنفی ہیں۔ مستند عالم دین بھی نہیں، لیکن ان کے ہاتھ پر امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے خانوادے کے چشم و چراغ شاہ اسمٰعیل شہید رح بھی شامل ہیں جو اہل حدیث ہیں۔ آج جو اہل حدیثیت ہمیں نظر آتی ہے وہ کل کی کل ان ہی کی مساعی کا ظہور ہے۔ لیکن وہ بیعت جہاد ایک حنفی کے ہاتھ پر کر رہے ہیں۔ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے بیعت ارشاد لی پھر بیعت جہاد لی۔ اس طرح ایک ہی شخصیت میں دونوں بیعتیں جمع ہو گئیں ۔۔۔ یہ تو اس صدی کے اندر آکر مغرب کے سیاسی استیلاء کے ساتھ ذہنی مرعوبیت کے پیش نظر دستوری اور قانونی تنظیمیں قائم ہونی شروع ہو گئیں، ورنہ اس سے قبل اس قسم کی کسی تنظیم اور جماعت کی تشکیل کا کوئی سراغ ہمیں اپنی تاریخ میں نہیں ملتا۔ اہل حدیث حضرات جو اس اجتماع میں تشریف رکھتے ہیں۔ وہ گواہی دیں گے کہ ان کے ہاں یہ تنازعہ عرصے تک چلا ہے اور شاید اب بھی چل رہا ہے کہ اہلحدیث حضرات کی تنظیم اور جمعیت کے علئے صدارتی نظام ہو یا امارتی نظام ہو ۔۔۔ اس تنازعہ کی حقیقت بھی یہی ہے کہ سنت اور صحابہ و تابعین کے دور میں صدارتی نظام کہیں نظر نہیں آتا کہ اتنے سال کے بعد صدر ہٹ جاتے اور پھر دوبارہ انتخاب ہو۔ یہ بات کہیں نظر نہیں آئے گی۔ وہاں تو یہ نظر آئے گا کہ جس کے ہاتھ پر بیعت ہوتی تھی وہ تاحینِ حیات ہوتی تھی۔ آپ کو ایک مقصد پورا کرنا ہے جب امیر وہ مقصد پورا کر رہا ہے تو آخر کس دلیل سے آپ اس کو الیکشن کے ذریعے بدلنا چاہیں گے! ہاں اگر وہ مقصد سے ہٹ گیا ہے تو آپ اپنا راستہ علٰحدہ لیں، ۔ بیعت فسخ کریں اور اپنے طور پر کام شروع کریں۔ کوئی اور ایسا نظر آئے جس پر اطمینان ہو کہ وہ بہتر کام کر رہا ہے تو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں ۔۔۔ حاصل یہ ہے کہ تجدید و احیائے دین کے لئے کام کرنے کا طریقہ سنت اور تعامل سلف صالحین سے بیعت کا نظام ثابت ہے۔ اس کے علاوہ جو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں، وہ اُسوۂ رسُول اور سُنّت سے ہٹے ہوئے ہیں۔

اس مختصر سے وقت میں کیا عرض کروں! ۔۔۔ یہ باتیں کہتے ہوئے دل روتا

ہے کہ ہمارا حال یہ ہے کہ جس طرح "وعظ" گالی بن گیا ہے جو قرآن کی اصطلاح ہے۔ اسی طرح 'بیعت' کے ساتھ جو خالصتاً قرآن و سُنّت کی اصطلاح ہے۔ ذہن میں فوراً دوکانداری کا تصور آتا ہے۔ قبّے عمامے اور جبّے کے ساتھ کوئی حضرت صاحب اور پھر ان کا ایک خاص اندازِ نشست و برخاست اور ایک خاص اندازِ گفتار کے ساتھ کسی شخصیت کا نقشہ سامنے آتا اور ذہن میں اُبھرتا ہے۔ جن کے ساتھ مریدین کا ایک حلقہ خدّام ادب کی حیثیت سے موجود ہوتا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں — اگر ہوگا تو یہ کہ کچھ ذکر کے حلقے ہو جائیں گے۔ اللہ اللہ خیر صلا — اس سے آگے ان کی کوئی دعوت نہیں — اس طرح ہم نے اس بیعت کو بھی بدنام کر کے رکھ دیا ہے — ہم نے کس چیز کو بدنام نہیں کیا ہے! چھوڑا کسے ہے! ؎

یہی شیخ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے   گلیم بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

ہم نے ہر چیز بیچ کھائی ہے — دوکاندار ہم ہیں۔ بدنام ہم نے دین کو کیا ہے — حج اور عمرے کے مواقع پر اسمگلنگ ہم کرتے ہیں لیکن بدنام حج ہوتا ہے۔ صوم و صلوٰۃ کے ساتھ سودی لین دین، بلیک مارکٹنگ، ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ اور بہت سی بدمعاملگیاں ہم کرتے ہیں۔ بدنام دین ہوتا ہے — لیکن ہاں ہم اگر ہم چلتے ہیں اُسوۂ رسُولؐ کی پیروی کریں تو بیعت کتنی ہی بدنام ہو چکی ہو ہمیں تو اُسی پر چلنا ہے — اگر وعظ گالی بن گیا ہے تو بنا کرے ہمارے لئے تو قرآن ہی وعظ ہے —— قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔ لٹریچروں سے۔ جو تیں چلتی ہوں تو چلا کریں۔ ہمارا لٹریچر تو یہی قرآن ہے — اسی کو پڑھو اور پڑھاؤ — اسی کو سمجھو اور سمجھاؤ۔ اسی کی شرح و وضاحت کرو، تحریر سے بھی تقریر سے بھی — ہر ایک کی اساس قرآن ہو۔ بفحوائے ارشادِ ربانی: بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ — اور بموجب فرمانِ نبوی: بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً —

'آپ حضرات بخوبی واقف ہیں کہ میں قرآن حکیم کا ادنیٰ طالب علم ہوں۔ قرآن مجید اور سیرتِ مطہرہ پر غور و فکر کے نتیجے میں جو بات مجھ پر منکشف ہوئی

ہے اس پر الحمدللہ عمل بھی شروع کر دیا ہے وہ یہ کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کوئی اضافی نیکی نہیں بلکہ میرا اور ہر مسلمان کا فرض عین ہے ۔ اس کے لئے تنظیم کا قیام لازم ہے اور اس تنظیم کی ہیئت تشکیل بیعت کے نظام پر ہونی عین سنت کا تقاضا ہے ۔ میں اگر محض درس قرآن ہی دیتا رہتا اور سیرتِ مطہرہ کا بیان ہی کرتا رہتا لیکن قرآن حکیم اور سیرت مبارکہ سے جو پیغام اور تعلیم مجھے ملتی، اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش نہ کرتا تو مجھ سے بڑا دھوکے باز کوئی اور نہ ہوتا ۔ میں درس قرآن، سیرتِ مطہرہ کے بیان اور وعظ کہنے کی حیثیت سے بہت مشہور (POPULAR) ہو گیا ہوں ۔ اسی ماہ تین مرتبہ میں کراچی ہوائی جہاز سے گیا ہوں جس کے آمد و رفت کا خرچ بلانے والوں نے اٹھایا ہے ۔ اور بہت سے حضرات ٹکٹ دے کر بلانے پر اصرار کرتے رہتے ہیں ۔ میں اگر کوئی "نذرانہ" بھی مقرر کر دوں تو وہ بھی مل جائے گا ۔ جو اہلِ باشناس چودہ پندرہ سو روپے ٹکٹ پر صرف کر سکتے ہیں وہ کیا چھ سات سو روپے مجھے "نذرانہ" نہیں دے سکتے ۔ آپ کو تو معلوم ہی ہو گا کہ ملک میں بہت سے واعظین کے باقاعدہ "نذرانوں" کے ریٹ (RATES) مقرر ہیں تو کیا میرے نہیں ہو سکتے ۔ ! تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ میرے درسِ قرآن کو پاکستان ہی میں نہیں بہت سے بیرونی ممالک میں بھی انتہائی قبول عام حاصل ہوا ہے ۔ میں یہی کام کرتا رہتا اور کبھی عمل کی دعوت نہ دیتا تو میرا خیال ہے کہ اس وقت اگر یہاں چار پانچ سو کی حاضری ہے تو ایسی صورت میں یہ حاضری ہزاروں سے کہیں متجاوز ہوتی ۔ میں یہ بات دعوے سے کہہ رہا ہوں، ہمارے ہاں صرف "سننے" کا تو اتنا ذوق و شوق ہے ۔ ہم سُنی ہیں اور خالص "سُنی" ہیں ۔ یہ جو بار بار عمل کی دعوت دی جاتی ہے اور غلط کاموں پر جو ڈانٹ پڑتی ہے، اُسے آدمی ایک دفعہ سن لے گا، دو مرتبہ سن لے گا ۔ بار بار کون سننے آئے گا ۔ ! میرے چند قریبی واقف کار میرے پیچھے جمعہ پڑھنا چھوڑ گئے انہوں نے مجھ سے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ تمہاری تقریر بہت سخت ہوتی ہے ۔ تم کاروبار میں سود کی آمیزش پر قرآن و حدیث کے حوالے

سے تنقیدیں کرتے ہو اور وعیدیں سناتے ہو۔ —تم متعدد غیر اسلامی معتقدات اور رسم و رواج پر شدید گرفت اور نکیر کرتے ہو۔ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اور جن حالات سے گزر رہے ہیں، ان میں ان کا ترک کرنا ہمارے لئے مشکل ہی نہیں محال ہے — تمہاری تقریریں سن کر ہمارا ضمیرِ ملامت گر ہمیں سرزنش کرتا ہے — اس کشمکش سے بچنے کے لئے ہم نے جمعہ تمہارے پیچھے پڑھنا اور تمہارے درس میں شریک ہونا ہی چھوڑ دیا ہے —— اگر مجھے صرف درس قرآن اور محض علمی نکات ہی کو بیان کرنا ہوتا تو موجودہ حاضری سے دس گنا حاضری زیادہ ہو سکتی تھی۔ لیکن نہیں میں قرآن کا عملی پیغام پیش کرتا ہوں۔ صرف علمی نکات پیش کرنا اور اس میدان میں موشگافیاں کرنا ذہنی عیاشی بن جائے گی۔ میرا قلب و ذہن مجھ سے پوچھتا ہے کہ اگر تم نے صرف یہی کچھ کیا تو اللہ کے ہاں کیا جواب دو گے؟ تم نے سب کچھ ہضم کر لیا ہے اگر اس قرآن کو بھی ہضم کر گئے تو فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَهٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ۝ (المرسلت) "پس اس کے بعد کون سی بات ہے جس پر تم ایمان لاؤ گے؟ —" بہر حال یہ چند باتیں تو بطور جملہ ہائے معترضہ درمیان میں آگئیں —— اب خوب توجہ سے میری آج کی تقریر کا خلاصہ پھر سن لیجئے۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میں نے اپنے فہم تک قرآن کا جو پیغام سمجھا ہے، وہی پیغام ہمیں احادیث میں ملتا ہے اور وہی پیغام ہمیں سیرت مطہرہ سے ملتا ہے —— اسی بات کو میں نے آج اُسوۂ حسنہ کے حوالے سے آپ کے سامنے رکھا ہے — اور وہ اسوۂ حسنہ یہ ہے

آپؐ کی دعوت ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالرسالۃ کسی تبلیغی، رفاہی، اصلاحی، علمی و تحقیقی اور سیاسی نوعیت کی نہیں تھی — بلکہ خالص انقلابی نوعیت کی دعوت تھی —— یہ تمام کام اس میں بطور اجزا شامل تھے۔ چنانچہ اس دعوت کے نتیجے میں جو انقلاب عظیم دنیا میں برپا ہوا، اس سے پوری انسانی زندگی میں تبدیلی رونما ہوئی — عقائد و نظریات، سیرت و کردار، نظام حکومت و سیاست، علوم و فنون، قانون و اخلاق، تہذیب و تمدن اور معاشرت اور معیشت، الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ بھی بدلے بغیر نہ رہا۔

یہ انقلابی جدوجہد خالص انسانی سطح (HUMAN LEVEL) پر قدم بقدم چل کر کی گئی اور ایک انقلابی جدوجہد کو جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، وہ سب مراحل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس انقلابی دعوت کو بھی پیش آئے — اللہ کی نصرت و تائید بھی حاصل ہوئی لیکن اُس وقت جب نبی اکرمؐ اور آپ کے جان نثار صحابہ کرام رضؓ نے اپنی امکانی حد تک اس جدوجہد میں مثالی قربانی اور ایثار پیش کیا۔

آپؐ کی جدوجہد جن مراحل سے گزری ان کو دو دو الفاظ کے جوڑوں کے ساتھ میں نے تین حصوں میں منقسم کر کے قدرے تفصیل کے ساتھ آپکے سامنے پیش کیا ہے۔

- پہلا مرحلہ ہے : دعوت و تربیت۔
- دوسرا مرحلہ ہے : تنظیم و ہجرت اور
- تیسرا مرحلہ ہے : جہاد و قتال

اس مختصر وقت میں، میں نے کوشش کی ہے کہ دعوت و تربیت اور تنظیم و ہجرت کے ضمن میں ضروری نکات آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ دعوت و تربیت کے مرحلے کے متعلق میں نے اس مختصر سے وقت میں آپکے سامنے چند اہم نکات اُسْوَۂ حَسَنَہ کی روشنی میں بیان کر دیئے ہیں۔ تنظیم تو دعوتِ ایمان قبول کرنے والوں کی آپ سے آپ ہو جاتی تھی۔ چونکہ جناب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور آپ کو رسول اللہ تسلیم کرنے کا لازمی تقاضا تھا کہ تمام اہل ایمان، ایک تنظیم، ایک جماعت اور ایک اُمّت بن جائیں اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی بے چون و چرا اور تسلیم و رضا کی کیفیات کے ساتھ پیروی کریں لہٰذا ہجرت تو تنظیم کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ کچھ اختیار کرو گے تو کچھ ترک بھی کرنا پڑے گا۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنی ہے تو ہر اس چیز کو چھوڑنا ہو گا جو اللہ اور اس کے رسُول کو ناپسند ہے۔ کسی سے جڑو گے تو کسی سے کٹو گے بھی۔ سیدھی سیدھی بات ہے۔ دین پر عمل کرنے کے باعث آج اپنے دوست سے کٹے تو کل اپنے بھائی

سے کٹو گے۔ ہو سکتا ہے کہ بیوی سے بھی کٹنا پڑ جائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ وقت بھی آجائے کہ ہر ایک چیز سے کٹنا پڑ جائے تو جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر سچا یقین رکھتے ہیں، وہ کٹ جایا کرتے ہیں۔ وہ گھر بار کو حتیٰ کہ وطن کو بھی چھوڑ کر ایسے نکل جاتے ہیں جیسے جانتے ہی نہیں تھے کہ یہ ہمارا وطن تھا۔ لیکن جو کسی اصول کی وجہ سے ایک دوست اور ایک بھائی سے نہ کٹ سکا۔ وہ اللہ اور اس کے دین کے لئے اپنا وطن چھوڑ دے گا؟ جو ایک پیسے میں امین ثابت نہ ہو گیا وہ لاکھ روپے میں امین ثابت ہو گا؟ جو چھوٹا سا وعدہ پورا نہ کر سکے، وہ بڑے بڑے وعدے پورے کرے گا؟ یہ باتیں ناممکنات میں سے ہیں ـــ ہجرت تنظیم کے ساتھ بطور ضمیمہ منسلک ہے۔ پھر جہاد ہے، "جہاد" دراصل اس جدوجہد کا نام ہے کہ جس میں ایک بندۂ مؤمن باطن میں اپنے نفس سے اس کو اللہ اور رسول کا مطیع و فرمانبردار بنانے کے لئے کش مکش کرتا ہے اور ظاہر میں دعوتِ حق کی تبلیغ کے لئے بھاگ دوڑ، سعی و کوشش اور اس کے قیام کے لئے محنت و مشقت بھی اسی جہاد میں شامل ہوتی ہے ـــ پھر قتال ہے، جب بھی اس کا مرحلہ آجائے تو ایک بندۂ مؤمن اس کے لئے تیار بھی رہے اور اس کی تمنا کو دل میں پرورش بھی کرتا رہے۔ حضورؐ کا ایک ارشاد ہے کہ جس دل میں اللہ کی راہ میں شہادت کی موت کی تمنا نہ ہو اس کی موت ایک نوع کے نفاق پر واقع ہوتی ہے"۔ (او کما قال)

سورۃ احزاب کے تیسرے رکوع کے آج کے درس میں ہم "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" کے بعد والی آیت ۲۲ اور ۲۳ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ: وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ۚ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا ۝ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُ ... وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ۝

"اور سچے مومنوں کا حال یہ تھا کہ جب انہوں نے (غزوہ احزاب کے موقع پر) حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا[1] اللہ اور اس کے رسول کی بات سچی تھی: اس واقعہ نے ان کے ایمان اور سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے وعدے کو سچ کر دکھایا ہے (یعنی وہ صبر و ثبات سے ڈٹے بھی رہے) اور ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا یعنی اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر چکا اور کوئی اپنی باری آنے کا منتظر ہے" ـــــ اس آیت میں "وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ" خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ ایک مومن کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ بڑے ذوق و شوق اور اشتیاق کے ساتھ اس بات کا منتظر رہے کہ کب وہ وقت آئے کہ وہ اللہ کی راہ میں گردن کٹا کر سرخرو ہو۔ چونکہ سورہ توبہ کی آیت ۱۱۱ کی رُو سے اہل ایمان اللہ سے سودا کر چکے ہیں اور جنت کے عوض اپنا مال اور اپنی جان اس کے ہاتھ بیچ چکے ہیں:

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ○

"یقیناً اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ قتل کرتے اور قتل ہوتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے ان کے اس طرزِ عمل پر پختہ وعدہ ہے تورات میں بھی، انجیل میں اور قرآن میں بھی۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہو! پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ کے ساتھ چکا لیا ہے

---

[1] اشارہ ہے سورہ البقرہ کی آیت ۱۵۵ کی طرف

بھی سب سے بڑی کامیابی ہے۔" آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس آیت شریفہ میں لفظ 'بیع' جس سے بیعت بنا ہے پوری جامعیت کے ساتھ قول و قرار اور عہد و پیمان کے لئے استعمال ہوا ہے ـــــ اس آیت کی رو سے مؤمنین تو اپنے مال اور اپنی جان اللہ کے ہاتھ بیچ چکے' اب جب بھی یہ مرحلہ آتے ـــــ اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کب آئے گا ـ یہ ہے اسوۂ رسول: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ـ

آگے کے مراحل کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا' جو کہتا ہے وہ حماقت کرتا ہے ـــ کچھ پتہ نہیں کہ کب کیا مرحلہ آجائے اور کیا صورت حال پیدا ہوجائے! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص دعوت دیتا رہے اور اسی میں اس کی زندگی تمام ہوجائے اور اس کو ایک ساتھی بھی نہ ملے ـ نبیوں میں یہ بھی ہوا ہے ـــ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کسی جگہ تمکن عطا فرما دے ـ اس کا دار و مدار ہماری سوچ پر نہیں ہے ـــ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو مکہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے تھے ـ مدینہ کی کھڑکی تو اللہ نے خود کھولی ـ مکہ میں اہل یثرب کے چھ اشخاص ایمان لے آئے ـ اگلے سال بارہ آدمی آگئے اور اس سے اگلے سال پچھتر آگئے اور بیعت عقبہ ثانیہ منعقد ہوئی ـــ پھر نبی اکرمؐ کے قدم مبارک ابھی وہاں پہنچے بھی نہیں کہ مدینہ آغوش وا دارالہجرۃ بن رہا ہے ـ اور حضورؐ کی تشریف آوری کا بڑے اشتیاق کے ساتھ انتظار کر رہا ہے اور استقبال کی تیاریاں بھی ـ اور مکہ جہاں حضورؐ بنفس نفیس تیرہ برس سے دعوت دے رہے ہیں' وہ خون کا پیاسا بنا ہوا ہے ـــ کون سے حساب کتاب میں یہ چیز آتی ہے ـــ یہ مشیت الٰہی ہے ـــ آگے کے مراحل کے بارے میں کوئی لال بجھکڑ بن کر کہے کہ یوں ہوگا اور یوں ہوگا ـ اس سے بڑا احمق اور کوئی نہیں ـــ وہ تو اللہ ہی جانتا ہے، ہم نہیں جانتے ـــ ہم اسوۂ رسول کے راستے پر چلنے کی کوشش کریں گے اگر اخلاص ہمارے شامل حال رہا تو اس راہ میں پوری زندگی کھپا کر یا سر کٹا کر دنیوی اعتبار سے ناکام ہوجانا بھی ہمارے لئے کامیابی ہے ـ اور کامیاب ہوگئے تو پھر تو کامیاب ہیں ہی ـ اسی کو

قرآن "حُسۡنَيَيۡنِ" سے تعبیر کرتا ہے ۔۔۔ اس راہ میں آخرت کے اعتبار سے ناکامی کا کوئی سوال ہی نہیں ۔۔۔ بالاکوٹ کے میدان میں راہ حق میں سر کٹانے والے کیا ناکام ہوئے! ہرگز نہیں ان کی کامیابی پر تو فرشتے رشک کرتے ہوں گے ۔ وہ تو شہادت کے مرتبے پر فائز ہیں، جو انبیاء اور صدیقین کے بعد آخرت میں سب سے اعلیٰ مقام ہے ۔

ہم نے اُسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں "تنظیم اسلامی" سمع و طاعت کی بیعت کی بنیاد پر بنائی ہے ۔ اگرچہ ہم بہت کچے ہیں ۔ تعداد کے لحاظ سے بھی قافلہ بہت ہی چھوٹا ہے اور اب تک جو ساتھی ملے ہیں وہ معیار مطلوب سے بہت نیچے ہیں ۔ لیکن میں اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں ۔۔ اس معاشرے میں سے مجھے جو ساتھی ملے ہیں وہ بھی غنیمت ہیں ۔۔ میں اللہ کے ہاں اپنا جواب تیار کر رہا ہوں کہ اے میرے رب! میں نے کچھ اور نہیں کیا ۔ مجھے تو نے جو صلاحیت، طاقت، توانائی اور استعداد عطا فرمائی تھی ۔ میں نے اُسے تیری کتاب مبین کے پیغام اور اسوۂ رسول ﷺ کی طرف دعوت دینے میں لگایا اور کھپایا ہے ۔ میں نے مداہنت نہیں کی ہے ۔ میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند ۔۔۔ میں نے کبھی اس کی پرواہ نہیں کہ یہ کہوں گا تو اہل حدیث ناراض ہو جائیں گے اور وہ کہوں گا تو احناف مجھ سے خفا ہو جائیں گے ۔ یا لوگ میرے درس اور تقریروں میں آنا چھوڑ دیں گے ۔ میں نے جس بات کو قرآن و سُنت کے مطابق حق سمجھا ہے اُسے ڈنکے کی چوٹ کہا ہے ۔ برملا کہا ہے بغیر خوف لَوْمَةَ لائم کہا ہے صرف اللہ کے خوف اور اس بات کو پیش نظر رکھنے کی شعوری کوشش کرتے ہوئے کہا ہے کہ: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝ (ق)۔

اور آج میں نے اُسوۂ رسول ﷺ کے حوالے سے اپنی استعداد کی حد تک ساری بات آپ کے سامنے رکھ دی ہے ۔ اب آپ سوچیے کہ آپ کس مقام پر کھڑے ہیں؟ ۔۔ فیصلہ آپ کا ہے ۔ ذمہ داری آپ کی ہے ۔ جواب دہی آپ کو کرنی ہے ۔ بات پوری سامنے آچکی ہے ۔ لیکن اگر کوئی تنظیم اسلامی کی دعوت کو مزید سمجھنا چاہتا ہو تو میں اس کو دعوت دوں گا کہ وہ تنظیم کے کتابچوں کا مطالعہ کر لے ۔۔۔ پھر

فیصلہ کرے - اگر وہ حدیث برحق ہے کہ: اَنَا اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ : بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ - "میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: جماعت کا اور سمع و طاعت کا اور اللہ کی راہ میں ہجرت و جہاد کا" - اور یقیناً برحق ہے تو اچھی طرح جان لیجئے کہ واقعہ یہ ہے کہ بغیر نظم جماعت کے زندگی بسر کرنا خلاف سُنّت زندگی ہے - کوئی اپنی جگہ بڑے سے بڑا سُنّت کا پرچارک بنا ہوا ہو اور خود کو متّبع سُنّت سمجھتا ہو — اگر وہ نظم جماعت کے بغیر زندگی بسر کر رہا ہے تو اس کی پوری زندگی خلاف سنت ہے — اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالٰے عنہ نے فرمایا تھا کہ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَۃِ۔ رضائے الٰہی اور اسوۂ رسول کی پیروی کے لئے جب تک اپنے آپ کو ایسی جماعت کے ہوا اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے قائم ہو حوالے نہ کر دیا جائے، زندگی بحیثیت مجموعی سنت کے مطابق نہیں ہوگی اور بات وہی ہوگی جو حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمائی تھی کہ مچھر چھانے جائیں گے اور سموچے اونٹ نگلے جائیں گے —

اُسوۂ رسولؐ سے میں نے دین کے انقلابی پیغام کے لئے دعوت و تربیت، تنظیم و ہجرت اور جہاد و قتال کے مراحل اور اس کام کے لئے ایک "تنظیم" کی ضرورت کے دلائل آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں - یہ بات قرآن حکیم سے سمجھنا چاہیں تو تھوڑے سے غور و تدبّر کے بعد ان شاءاللہ سورہ آل عمران کی یہ آیت مبارکہ تنظیم کی دعوت کو سمجھنے کے لئے کفایت کرے گی :-

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اس موضوع پر مزید روشنی کے لئے مطالعہ فرمائیں:

(۱)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا مقصدِ بعثت

اور

انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج

(۲)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

(۳)

رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم

از

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

سُورۃُ الاحزاب کے تیسرے رکوع کی روشنی میں

درسِ قرآن وخطابِ عام

ڈاکٹر اسرار احمد

ترتیب وتسوید
شیخ جمیل الرحمٰن